مستنصر حسین تارڑ
منطق الطیر، جدید

منطق الطیر، جدید

(ناول)

مستنصر حسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4394 Tarar, Mustansar Hussain
Mantiq-ul Tair, Jadeed/ Mustansar
Hussain Tarar.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2018.
200pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2018ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3157-4
ISBN-13: 978-969-35-3157-2

Sang-e-Meel Publications

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝

(اور وارث ہوا سلیمان، داؤد کا، اور کہا اُس نے اے لوگو سکھائی گئی ہے ہمیں بولی پرندوں کی اور عنایت فرمائی گئی ہے ہمیں ہر چیز، بے شک یہ اُس کا فضلِ خاص ہے)

(سورت نمل آیت نمبر سولہ)

''انتساب''

پرندوں کی بولیاں میرے کانوں
میں پھونکنے والے مُرشد عطار کے نام..

''خصوصی شکر گزاری''
باکمال شاعر ڈاکٹر انیس احمد کی جنہوں نے اس مسودے کو پرکھا
اور میری معاونت کی

"عطار عشق کے سات شہروں میں سے گزرا جب کہ میں ابھی پہلی گلی کے موڑ پر ہوں۔"

(مولانا رُوم)

"گرو پکڑ کے سیس تُوں لٹ کُتری
گن پاڑ کے مُندراں پاوندا اے
گجھ منگ لے بے پرانیا اوئے
ملے والا ہے [illegible]یں داسنت بھارا"

(قصہ پُورن بھگت)

"میرا یار لاکھوں میں ایک ہے
عارف اور عاشق ہے اور نام عطار ہے
تو بھی اگر عشق کرنا چاہے تو
"وصلت نامہ" اور "منطق الطیر" سُن لے"

(سچل سرمست)

''ٹلہ جوگیاں کی تنہا چوٹی پر جوگیوں کی خانقاہ واقع ہے جس کی بلندی ۳۲۰۰ فٹ ہے جو جہلم سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، جو کہ شمالی ہندوستان میں قدیم ترین مذہبی ادارہ ہے..اسے ان دنوں ٹلہ گورکھ ناتھ، جوگی ٹلہ یا صرف ٹلہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اگرچہ اسے پرانے وقتوں میں ٹلہ بالناتھ بھی کہا جاتا تھا.. بالناتھ ٹلے کی بنیاد رکھنے والے داستانوی گورکھ ناتھ کا چیلا تھا..

''ہندوستان کا قدیم جغرافیہ'' میں کننگھم نے اس ٹلے کے حوالے سے ایک عجیب داستان کا حوالہ دیا ہے جسے یونانی تاریخ دان پلوٹارچ نے اپنی تاریخ میں رقم کیا ہے.. پلوٹارچ کا کہنا ہے کہ 326-BC میں راجہ پورس مقدونیہ کے سکندر کے مقابلے کے لیے جنگی تیاریاں کر رہا تھا تو اُس کا شاہی ہاتھی سُورج کی مقدس پہاڑی پر چڑھ گیا اور انسان کی آواز میں پورس سے درخواست کی تھی کہ وہ سکندر کے مقابلے پر نہ اترے..ازاں بعد اس پہاڑی کو ''ہاتھی کی پہاڑی'' کے نام سے پکارا جانے لگا..علاوہ ازیں کننگھم نے ٹلہ جوگیاں کے حوالے سے مزید ثبوت کھوج نکالے اور ثابت کیا کہ سکندر اعظم کے زمانے میں بھی ٹلہ جوگیاں کی خانقاہ موجود تھی..

پلوٹارچ نے فل ناتھ یا ہل ناتھ کا تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے وہ ہاتھی کا متبادل بتایا جاتا ہے (عین ممکن ہے کہ ناتھ دراصل بالناتھ یا گورکھ ناتھ کی ایک شکل ہو)..

''آئین اکبری'' میں ابوالفضل بھی اس ٹلّے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ عبارت لکھتا ہے کہ.. بالناتھ جوگی کا مندر جسے ٹلہ بالناتھ پکارتے ہیں، ہندوستان کے درویشوں میں نہایت عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے.. ہندوستان کے علاوہ اس ٹلّے کی شاخیں نیپال اور افغانستان میں بھی موجود ہوا کرتی تھیں..

(GAZETTEER OF THE JEHLUM DISTRICT)

چار چیزیں تھیں جو ہر دسمبر میں بُلاتی تھیں..

ان میں سے ایک شکار تھا، قادر آباد کی جھیلوں کے آس پاس.. جہاں کبھی وہ چارمُرغابیاں اتری تھیں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا..

وہ جھیلیں جوہڑوں میں بدل چکی تھیں، خشک ہوتی جاتی تھیں، ندی سرسوتی کی مانند سوکھتی جاتی تھیں..

وادیٔ سوات کا ایک سلیٹی منظر تھا جس کی سرد ہواؤں کے دوش پر جنگلی نرگس کے وہ زرد کٹورے پھول جو قبرستان کی زرخیز ہو چکی مٹی میں سے پھوٹتے تھے اُن کی مہک ایسی اپسراؤں کی مانند تیرتی تھی جن کے بدن چھونے سے تحلیل ہو جاتے ہیں... وہاں دریائے سوات کے برفیلے آہستہ رو پانیوں کے کناروں پر افغان ہوٹلوں کے کابلی پلاؤ کی مہک کی آلودگی اس منظر میں زہر بھرتی ہے.. خوراک کے کھوکھے قطار اندر قطار.. جنگلی نرگس کی مہک صرف قبرستان میں محدود ہو کر رہ گئی ہے، اُس سے آشنا ہونے کے لیے وہاں دفن ہونا شرط ہے..

کامران کی بارہ دری کی نانک شاہی اینٹوں سے لگ کر بہتا دریائے راوی تھا جو لاہور کے فضلے اور غلاظت سے بوجھل ہو کر بہتا نہیں، تھم گیا ہے..

اور چوک چکلا تھا..

ایک اسلامی جمہوریہ میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں بیسواؤں، بدن فروش طوائفوں اور

رنڈیوں کے نام پر ایک چوک ہو.. اُسے ختنے بٹھا کر فوری طور پر چوک بخاری کا نام دے دیا گیا ہے... بخارا والوں کو ابھی کچھ خبر نہیں کہ شہر لاہور کا ایک چوک.. وہاں سے آئے ہوئے کسی باشندے کے نام کر دیا گیا ہے.. اور یوں اُسے پاکیزگی کا ایک پیراہن پہنا دیا گیا ہے جہاں گئے زمانوں میں پیراہن اترا کرتے تھے..

وہ سب زمانے راکھ ہو چکے..

یہ زمانے اور کے اور ہو چکے ہیں، لیکن بُلاوے اب بھی آتے ہیں.. وہ چار چیزیں اگرچہ سب کی سب معدوم ہو گئی ہیں تو اُن کی جگہ.. جیسے ایک ندی کے پانی ہمیشہ وہی نہیں رہتے، بہتے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے پانی آ جاتے ہیں ایسے... چار نہیں، بہت سی چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے ٹلہ جوگیاں کو بُلاتی ہیں..

ان میں سرفہرست ٹلہ جوگیاں ہے.. میں جاناں جوگی دے نال نال.. والا ٹلہ جوگیاں اور دیگر ''چیزیں'' اسی ہاتھی شکل والی پہاڑی سے گئے زمانوں سے منسلک ہیں..

ان میں جوگی گورکھ ناتھ ہے جو سنکھ پھونکتے اپنے کان پھاڑ کر تقریباً دو ہزار برس پیشتر جانے کہاں سے اور کدھر سے ادھر آ نکلا، اس ٹیلے کی چوٹی کی تنہائی اور ایک کائناتی چُپ کے اندر دھونی رمائی اور براجمان ہو گیا.. گورکھ ناتھ کے پھٹے ہوئے کانوں میں سے جو خون رستا تھا اُس کی ہر بوند میں سے ''انا الحق'' کی صدا آتی تھی جو صدیوں بعد بغداد کے حلاج کے کانوں میں ایک اذان کی صورت بلند ہوئی اور اُس نے نمازِ عشق قضا نہ کی، اپنے لہو سے وضو کر کے سرخرو ہوا.

گورکھ ناتھ نے کونسے رَب کی ثنا کی.. کہ اُسے ایک گورکھ دھندا قرار دے دیا..

-- رَب اِک گنجھلدار بجھارت

رب اک گورکھ دھندا

کھولن لگیاں پیچ ایس دے

کافر ہو جائے بندا

کافر ہونوں ڈر کے جیویں

کھوجوں مول نہ کھنجیں

لائی لگ مومن کولوں

کھوجی کافر چنگا..

("ساوے پتر" موہن سنگھ)

یہ عام سا ٹیلہ.. جہلم کی وادی میں سے تقریباً تین ہزار دو سو فٹ کی بلندی تک پہنچتا آخر کیوں اتنا برگزیدہ ٹھہرا کہ یہ نہ تو کوہ طور تھا، نہ ہی یروشلم کی کوئی پہاڑی تھی اور نہ ہی کوئی جبل نور تھا اور اس کے باوجود اس کے اندر کوئی ایسی الوہی کشش تھی کہ جن لوگوں کے اندر عشق آتش بھڑکتی تھی، آسمانوں پر جاتی عرشوں کو سلگاتی تھی وہ اس کی جانب یوں کھنچے چلے آئے، بے اختیار اس کی کوہ نوردی اختیار کی، جیسے لوہے کے ذرّے ایک مقناطیس کی جانب ایک بے بسی کی حالت میں لڑھکتے چلے آتے ہیں..

راجہ چندر سین کا لاڈلا فلسفی اور شاعر بیٹا بھرتری ہری، مولانا رُوم "جاوید نامہ" میں علامہ اقبال سے اس کا تعارف کرواتے ہیں.. کہ اسے ملو، یہ نوا پرداز ہندی، نکتہ آرا اور نوائے ارجمند رکھنے والا ہے اور جس کا فقر میں ایک مقام بلند ہے اور وہ خود جم اور اس کے شعر جام جم ہیں..

۔ او جم است و شعر او جام جم است

علامہ اقبال بھرتری ہری کی تعظیم کرتے ہیں اور اُس کے ایک شعر کو اپنی خوش کلامی کے معجزے سے زندۂ جاوید کر دیتے ہیں..

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پہ کلامِ نرم و نازک بے اثر..

بھرتری ہری ''جاوید نامہ'' کی سحر انگیزی سے بصد ادب رخصت ہوا تو ٹلہ جوگیاں کی مسافت کا قصد کیا..

سیالکوٹ کے راجہ سلوان کا بیٹا پُورن، اکلوتا اور سہکواں، پیدائش پر پنڈت راجہ سلوان سے کہتے ہیں کہ اسے بارہ برس تک کسی کی نظر نہ لگے، اندھیری کوٹھڑی میں لوگوں کی آنکھوں سے بچائے رکھو..اُس کی ماں بے چاری ماری رانی اچھراں دل پر پتھر رکھ کر پنڈتوں کا فیصلہ قبول کر لیتی ہے، پُورن جوان ہو کر اپنے اندھیارے جہان سے نکلتا ہے تو اُس کی سوتیلی ماں رانی لُونا اُس پر عاشق ہو جاتی ہے، اور یہ داستان جہاں یونانی المیہ ڈرامے ''ایڈی پس'' سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے کہ وہاں بھی ایک سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بیٹے کو دل دے بیٹھتی ہے وہاں یہ قصہ یوسف زلیخا کی قربت میں بھی کچھ شائبے جھلکاتی ہے.. پُورن جب رانی لُونا کے بدن کی پیاس بجھانے سے انکاری ہو جاتا ہے تو رانی، راجہ سلوان کے سامنے ایک مکر رانی کے روپ میں پُورن پر الزام دھرتی ہے کہ اُس نے اُسے بے حرمت کرنے کی کوشش کی تھی..راجہ صاحب نوجوان اور خوبصورت رانی لُونا کے دام میں آجاتے ہیں اور پُورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیتے ہیں... مدتوں بعد اُدھر سے جوگی گورکھ ناتھ کا گزر ہوتا ہے، وہ پُورن کو کنویں میں سے نکال کر اُس کے ہاتھ پاؤں بحال کر دیتا ہے اور اُس کے کان پھاڑ کر اپنا جوگی بنا لیتا ہے..

؎ گرو پکڑ کے سیس توں لٹ کُترمی
کن پاڑ کے مُندراں پاوندا اے
گُھ منگ لے بے پرانیا اوئے
ٹلے والا ہے سائیں داسنت بھارا

پُورن جواب ایک بھگت ہو چکا ہے وہ اپنے گورو کی سنگت میں ٹلہ جوگیاں جا بسیرا کرتا ہے..

بے شک ٹلہ جوگیاں کے جوگیوں کے احترام میں بہت سے شہنشاہ اور بادشاہ اپنی اپنی غرض سے اس کی بلندی پر پہنچے.. سکندر اعظم سے لے کر اکبر اعظم تک.. جس نے جوگیوں کی فرمائش پر وہاں ایک عظیم تالاب تعمیر کیا، بابر بھی ان خطوں میں آیا تھا..

''دریائے سندھ سے پانچ منزلوں کے سفر کے بعد چھٹی منزل کوہ جُوڈ کے دامن میں آتی ہے جو بالناتھ جوگی کے پہاڑ کے دامن میں ہے..''

لیکن ہمیں ان سے کیا غرض جو غرض رکھتے تھے.. ہمیں تو صرف اُن سے غرض جو کوئی غرض نہ رکھتے تھے، تلونڈی کے گورونا نک سے غرض جنہوں نے ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر چھ ماہ کا چلّہ کاٹا اور پانچ چراغ روشن کیے..

؎ سچا روز ازل سے پہلے.. سچا روز ازل بھی وہ
سچا ہے وہ آج بھی نانک.. سچا ہوگا کل بھی وہ..

ذرا تخت ہزارے کا قصہ چھیڑیے جہاں رانجھوں نے رنگ مچایا تھا.. دھید ورانجھا ناز

نخروں، لاڈ، پیار اور چناب کے جنگل بیلوں میں چرتی مست آنکھوں والی بھینسوں کے دودھ مکھن سے پلا، جس میں نسوانی نزاکت کے پرتو تھے اور جسے ہیر سیال کی مردانگی کے عشق نے رانگلے پلنگ پر سلایا.. وہ ہیر کے ہجر کی آگ میں بھسم راکھ ہوتا پانچ پیروں سے مُنہ موڑ کر ٹلہ جوگیاں بالناتھ سے اپنے دُکھ کی دوا لینے جاتا ہے.. کان چھدوانے اُن میں مُندراں ڈال کر جوگی ہو جانے کو جاتا ہے..

- بالناتھ دے ٹلے دا راہ پھڑیا متا جا گیا گن پڑوانیاں دا
ٹلّے جائیکے جوگی نے ہتھ جوڑے سانوں اپنا کر وفقیر میاں..
چھڈ یاریاں چوریاں دغا جھٹا، بہت اوکھیاں ایہہ فقیریاں نیں

بے شک حلاج ٹلہ جوگیاں پر نہ چڑھا، صلیب پر چڑھایا گیا کہ اُس کے لیے وہی ٹلہ جوگیاں کا ایک مظہر تھا.. اور نہ خاتون نجم اس کوہ پر بلند ہوئی کہ اُسے تو بہاء اللہ کے عشق میں بُلند نہیں ہونا تھا، ایک تاریک کنویں میں گرتے جانا تھا.. پر عشق کے ہاتھی کے روندے ہوئے جتنے بھی ہوتے ہیں وہ ٹلے کے راستے میں پڑتے ہر پتھر کے مسام میں سانس لیتے ہیں، ہر جھاڑی کی گھناوٹ میں اُن کی موجودگی کی وہی آگ روشن ہوتی ہے جو کبھی کوہ طور کی بلندی پر ظاہر ہوئی تھی..

■•♦•♦•♦•■

دن دسمبر کے تھے..

مُوئے حسین کے عناصر میں اعتدال کم ہوتا جاتا تھا..وہ بوڑھا ہوا جاتا تھا اور شاید ایک مرتبہ پھر کسی سلگتی آگ کی کھوج لگانے اُس جوگی پہاڑ پر چڑھتا جاتا تھا..

اُس سے کوئی تو پُوچھے کہ اگر ایک بار جلتی ہوئی جھاڑی کے سامنے جُوتے اتار کر تم نے قدم رکھا کہ تمہیں خبردار کیا گیا تھا، سرنگوں ہو گئے تھے تو اب ہزاروں برس بعد تم پہ کیا افتاد آن پڑی ہے کہ تم ایک بار پھر ایک اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے اس بڑھاپے میں جب بقول شاہ حسین تمہاری ہڈیاں کڑکنے لگی ہیں، بدن ہوتے جاتے ہو

نہ تمہیں کوئی سندیسہ آیا، اور نہ ہی وہاں آسمان کی قربت میں کوئی روشنی نظر آئی اور اس کے باوجود اپنی جان کو آزار میں ڈالتے ہو..

تمہارے گھٹنوں میں گنٹھیا بسرام کرتا ہے، گو وہ خشک ہو چکا ہے..

نہ تم سے ٹھہرا جاتا ہے نہ چلا جاتا ہے تو اپنے آپ کو ایک نیم اپاہج کی مانند چڑھائی پر کیوں گھسیٹتے جاتے ہو..

وہ جو دس احکام طُور کی چٹانی تختیوں پر اُس کی لکھنے والی اُنگلی سے ثبت کردہ، اپنے دونوں بازوؤں میں حمائل کیے، اُس سے ہم کلامی کے بعد، منتظر بنو اسرائیل پر اترے تھے تو کیا وہ احکام بدل گئے ہیں جو یُوں ایک اور کوہ پر چڑھتے جا رہے ہو..

شاید تم شک شبہے کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ گئے ہو کہ وہ دس آسمانی احکام آج کی دنیا میں دو ہزار برس بعد لاگو نہیں ہو سکتے..

آسمانوں سے ایسے نئے احکام کا نزول ہونے کو ہے جو آج کے زمانوں پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس عہد میں وہ سب کچھ متروک ہوتا جاتا ہے جو کبھی آسمانوں سے نازل ہوا تھا..

تو کیا اس لیے ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر پہنچنے کا قصد کیا ہے؟

پر یہ وہ مُوسے تو نہ تھا، اس کے ہاتھوں میں عصا نہ تھا، صرف ایک بُرش تھا جسے وہ کینوس پر لگاتا تھا تو معجزے رونما ہوتے تھے، کھلی فضاؤں میں، سردیوں کی دُھند آلود سویروں اور گرمیوں کی تنور دہکتی دوپہروں میں وہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے قدرتی مناظر کو اپنے کینوس پر یوں منتقل کرتا تھا کہ وہ ایسے وجود میں آنے لگتے تھے کہ بڑا تخلیق کار کون ہے، جس نے اس منظر کو تخلیق کیا، اس میں ہریاول بھری، پانیوں کو رواں کیا، شجروں پر سرخ پھول کھلائے اور ان سب کو موسموں کے مطابق کبھی دھند میں نیم ملفوف کیا اور کبھی کڑی دھوپ میں عریاں کیا.. یا وہ ہے جو کینوس پر بُرش لگا کر کہتا ہے کہ تو پانی ہو جا.. اور وہ پانی ہو جاتا ہے اور اُسی بُرش کو کینوس سے چھو کر کہتا ہے کہ اگرچہ ابھی موسم نہیں ہیں لیکن کیکر کے اس خاردار درخت کے ہر کانٹے کی نوک پر ایک زرد پھول کھل جائے اور پھول کھلنے لگتے ہیں.. ابھی سرسوں کے کھیت ہریاول میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ابھی اُس کے بُرش کے معجزے سے وہ زردی کا ایک بَن ہو جاتے ہیں.. اُس مُوسے کے عصا اور اس مُوسے کے بُرش میں سے معجزوں کے جھرنے پھوٹتے ہیں اگرچہ اس نے کبھی پیغمبری کا دعویٰ نہ کیا..

نہ صرف اُس کے گھٹنوں میں گنٹھیا اتر رہا ہے بلکہ بڑھاپے کا ایک اور آزار، سیاہ موتیے کی صورت میں اُس کی آنکھوں میں اتر رہا ہے، اُسے کم دکھائی دینے لگا ہے.. اُس نے ایک مدت سے کینوس کو اپنے بُرش سے چھوا نہیں تھا، وہ اپنے تئیں بُرش کو زرد پینٹ میں ڈبوتا، وہ بُرش کینوس پر لگاتا

تو تصویر سیاہ رنگ میں ڈوب جاتی، اب وہ کرشمہ چھن چکا تھا کہ وہ تخلیق کار کی مانند اذن دیتا کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا تھا، بالآخر وہ اُس پر بازی لے گیا..

مُوئے حسین کے گھٹنوں میں یوں ٹیسیں پھوٹتی تھیں جیسے کیکر کے نوکدار کانٹوں کی ایک فصل اُس کے خشک ہو چکے ہڈیوں کے گودے میں سے پھوٹتی ہے..

دِن دسمبر کے تھے..

جتنے بھی دشت تھے، ویرانے، بیاباں، صحرا اور بے انت میدان تھے، جو کچھ بھی دریاؤں میں تھا، زمینوں کے اندر تھا، سمندروں میں پوشیدہ تھا، کائناتوں میں پنہاں تھا، جتنے بھی چرند پرند تھے، رینگتے ہوئے مکوڑے اور پتھروں کے اندر رزق حاصل کرنے والے کیڑے تھے وہ سب کے سب چُپ تھے، گُنگ تھے.. خاموشی بال کھولے سو رہی تھی.. نہ کہیں سے سُریلی بھجنوں کی مدھم مدھرتا سنائی دیتی تھی، نہ کسی گنبد تلے آوے ماریا کی صدائیں گونجتی تھیں، نہ کہیں فلاح کی جانب پکارتی کوئی آواز تھی.. نہ کوئی فریاد تھی اور نہ ہی کوئی دوہائی تھی.. پھر اس چُپ کی اتھاہ سلطنت کی شیشہ گری میں ایک پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی جس نے اس کارگہہ شیشہ گری کو کرچی کرچی کر دیا..

اور ہر کرچی پر ایک پرندے کا عکس نقش تھا..

پرندے جو ہمیشہ سے موجود تھے وجود میں آنے لگے..

یہ طے نہیں ہے کہ کونسا پرندہ پہلے وجود میں آیا کہ وہ سب ہمیشہ سے موجود تھے..

پرندے فرار ہو رہے تھے..

کپل وستو کے شہزادے گوتم کے گیان دھیان میں گُم فاقہ کش بدن کی پسلیوں کی ناتوانی

کے اندر وہ پرندہ جو گھونسلا بنائے بیٹھا تھا، اُس کا بدن بھی لاغر ہو چکا تھا، اُس نے بمشکل اپنے پر کھولے بُدھ کی پسلیوں کے گھونسلے میں سے پھڑ پھڑاتا، گرتا پڑتا، بالآخر پرواز کے قابل ہو گیا.. دنیا بھر میں جتنے بھی پرندے وجود سے موجود میں آئے وہ سب اُڑانیں کرنے لگے..

اُن میں وہ جھلسا ہوا پرندہ بھی تھا، جو کب سے طُور کی سلگتی جھاڑی کے اندر گھونسلا بنائے بیٹھا تھا، اُس جھاڑی کا بیج کہیں آسمانوں سے گرا، طُور کی مٹی میں دفن ہو کر پھوٹا اور پھر عشق کی آگ کی تپش میں سلگنے لگا.. شاید وہ پرندہ اپنی مختصر حیات کے دن اُسی جھاڑی کی سلگاہٹ کو برداشت کرتے ہوئے بسر کر جاتا پر طُور کے دامن میں سے ایک چرواہا اپنا عصا ٹیکتا آیا اور اُس جھاڑی میں ایسی آگ روشن ہوئی کہ اُس کے بال و پر جلنے لگے، وہ فرار پر مجبور ہو گیا.. پرواز کے دوران اُس نے بہت مدھم آہستگی اختیار کی کہ کہیں اُس کے سلگتے ہوئے بال و پر بھڑک کر اُس کے وجود کو راکھ نہ کر دیں..

بُدھ کی پسلیوں میں جس نے ایک ایک تنکا جمع کر کے گھونسلا بنایا تھا اور وہ جس کے پَر جھلس چکے تھے، ان کے سوا اور بھی پرندے تھے جو اپنے آبائی مسکنوں سے فرار ہو رہے تھے.. شاید وہ جو اپنے قدیم مسکنوں کو ترک کر رہے تھے اُن کے لیے فرار کی تہمت مناسب نہیں.. ان پروں کی پوٹلیوں کے اندر جو بیر بہوٹی جتنے سرخ دل ایک ہی مقام پر دھک دھک کرتے تھے اُن پر دستک دینے سے نہایت مدھم سرگوشیوں میں کچھ سنائی دیتا تھا.. اگر انہیں مٹھی میں نرمی سے بھینچ کر کان کے ساتھ چھوا جائے تو سرگوشیاں قدرے بلند ہو کر سنائی دینے لگتی تھیں.. نہیں ہم فرار نہیں ہو رہے.. میں جو طور کا جھلسا ہوا پرندہ ہوں، فاختہ کی شکل رکھتا ہوں میرے اس بیر بہوٹی جتنے دل میں شکوک ابھرنے لگے تھے، اگر آپ ڈھائی ہزار برس ایک ہی تختی پر اُلیکے ہوئے آسمانی فرمان پڑھتے رہیں تو وقت

گزرنے سے وہ مدھم پڑ جاتے ہیں، اُن پر زمانوں کی راکھ اترتی رہتی ہے یہاں تک کہ گمان گزرتا ہے کہ اگر یہ احکام ہمیشہ کے لیے ہیں، کائناتوں کے انت تک کے لیے ہیں تو ان پر زمانوں کی گزران کا کچھ اثر نہ ہونا چاہیے، اس تختی پر جب اس کی انگلیاں احکام یوں ثبت کرتی تھیں کہ ہر حرف بھڑک اٹھتا تھا تو یہ بھڑک اگر وقت کی مسافت کی مٹی سے اٹ کر بجھ گئی ہے، احکام مدھم پڑتے جاتے ہیں تو گویا یہ محض اُن زمانوں پر وقتی طور پر نازل ہوئے تھے.. میں جو ہزاروں برسوں سے ایک طوطے کی مانند یہ احکام دوہراتا رہتا تھا مجھ میں شک کے ایک سنپولیے نے جنم لیا.. طور کی جھاڑی کی راکھ میں کب تک اپنے پَر پھڑ پھڑا کر اُسے اپنے چہرے پر ڈال کر، اُس راکھ سے اپنی آنکھیں نابینا کر کے ایک ایسی تسبیح کے دانے گراتا رہتا جس کے ہر دانے پر شک کے سنپولیے کنڈلیاں مارے بیٹھے تھے.. میں نے اپنی من مرضی سے طُور کے گھونسلے کو چھوڑا کہ آسمانی سچائیوں کے پیمانے بھی اُس تختی پر نازل شدہ احکام پر جمی ہوئی راکھ میں پوشیدہ ہو چکے تو آؤ آج کی نئی سچائیوں کی تلاش میں نکلو.. تو میں فرار تو نہ ہوا، دل و جان سے اپنے بیر بہوٹی دل کی مشاورت سے طور کی بلندیوں کو ترک کیا..

بُدھ کے فاقہ زدہ بدن کی پسلیوں میں سے نکلنے والے پرندے کے بیر بہوٹی دل نے بھی بغاوت کر دی.. اُسے الہام ہوا کہ طور کا جھلسا ہوا پرندہ ایک ناخوشی، شبے اور شک کی حالت میں پرواز کر گیا ہے تو وہ.. بُدھ پکھیرو تو اُس کا بھی بزرگ تھا، وہ تب وجود میں آیا جب طور کی چوٹی پر ابھی اُس جھاڑی کا بیج بویا ہی نہ گیا تھا.. وہ بھی مائل پرواز ہوا..

جہاں کہاں بھی ایسے پرندے تھے جو ناخوش تھے اور اُن کے پروں تلے شک کے سنپولیے سرسرانے لگے تھے، وہ سب بغاوت پر آمادہ ہوتے گئے..

اور وہ ایک پرندہ ایک ناخن جتنا مختصر تب وجود میں آیا تھا جب ابن مریم کی بائیں ہتھیلی میں ایک میخ ٹھونکی گئی تھی اور اُس ہتھیلی کی لکیروں میں اُن مر چکے لوگوں کی فریادیں تھیں جنہیں وہ اپنی مختصر حیات میں زندہ نہ کر سکا تھا اور اُس ہتھیلی میں جب ایک میخ ٹھونکی گئی اور اُس میں سے لہو کی ایک بُوند پھوٹی، اُس ایک بوند نے شکایت کی، فریاد کی کہ اے میرے رب تو نے مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا، میری مدد کو کیوں نہ آیا.. اور جب اُدھر سے کچھ جواب نہ آیا، فریاد کی شنوائی نہ ہوئی تو اُس پہلی بُوند میں سے اُس ناخن جتنے پرندے نے جنم لیا.. جیسے پھانسی کے تختے پر گھاس نہیں اُگتی، ایسے ایک صلیب کے شہتیروں میں گھونسلا نہیں بنایا جا سکتا چنانچہ وہ پرندہ ابن مریم کے پیاسے ہونٹوں کے قریب ہوا، اُن پر اپنی چونچ رکھ کر اپنے مختصر بدن میں جتنی بھی نمی تیرتی تھی، بُوند بھر بھی نہ تھی کہ وہ خود ایک بُوند کا پروردہ تھا، اُس کے سوکھے ہوئے لبوں کو تر کرنے کی کوشش کی.. اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ابن مریم کو تنہا چھوڑا.. دریائے اُردن کی جانب اُڑا جس کے پانیوں سے یحییٰ نے لوگوں کا بپتسمہ کیا، اُنہیں نہلایا دھلایا، ظہور میں آنے والے مسیحا کے استقبال کے لیے پوتر کیا.. اُسی دریائے اُردن کے پانیوں میں اُس نے اپنی چونچ ڈبوئی ایک بُوند پانی کی بھری اور واپس آ کر ابن مریم کے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کو تر کیا...

وہ مسلسل عیسےٰ کی صلیب اور دریائے اُردن کے درمیان اُڑان کرتا بُوند بُوند پانی لاتا رہا اور ایک بار جب وہ واپس آیا تو صلیب کے شہتیروں پر میخوں سے ٹھونکا گیا ابن مریم وہاں نہ تھا، البتہ جہاں جہاں، ہتھیلیوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونکی گئی تھیں.. وہاں وہاں لکڑی کے مساموں میں سے خُون رِستا تھا، وہ آسمانوں پر اٹھایا جا چکا تھا.''وہ یہاں نہیں، وہ تو بلندیوں کی جانب چلا گیا''..

پرندے نے اُس اجڑ چکی صلیب کو اپنا مسکن بنا لیا، اُس صلیب کا سنگھار ابن مریم تھا اُس

کے اٹھائے جانے سے وہ ایک بیوہ ہو گئی.. وہ جانے کتنی صدیاں اُس کی جدائی سے نڈھال وہاں قیام پذیر رہا اور پھر اُس کے دل میں بھی شک کے ایک بُوٹے نے جنم لیا.. اگر وہ جس کے دربار میں ابن مریم نے فریاد کی وہ بھی اُس کی مدد کو نہ پہنچا تو کیا وہ ہے بھی کہ نہیں.. اگر ہے تو کس صورت، کہاں ہے.. اُس کی تلاش میں نکلنا چاہیے.. اور وہ نکل گیا..

وہ تینوں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر اڑان کرتے چلے جاتے تھے اور اُن کے پروں تلے زمین کا کبھی خوش رنگ اور کبھی ویران قالین کھسکتا جاتا تھا..

غارِ حرا کے شگافوں میں سے چاندنی کے جزیرے اترتے تھے، گئے زمانوں میں جب کسی قدرتی اتھل پتھل سے اُس پہاڑ کی چوٹی کے پتھر گرتے گئے اور ایک گپھا کی صورت ظہور میں آئی، اُن پتھروں کے درمیان میں جو شگاف تھے، اُن میں سے چاندنی کے ٹکڑے داخل ہوئے اور اُس کی تاریکی میں جزیروں کی صورت پتھروں کے فرش پر روشن ہوتے گئے.. ان شگافوں میں سے ایک شگاف کے اندر وہ پرندہ ازل سے مقیم تھا جو فنا سے آشنا نہ تھا.. ازمنۂ قدیم سے وہ مختصر گپھا اُن لوگوں کی پناہ گاہ تھی جو تجسّس رکھتے تھے، متلاشی تھے اور اُنہیں حنیف کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا.. وہ سچ کی تلاش میں اس غار کی بلند تنہائی میں خلقت سے الگ ہو کر تنہا آ بیٹھتے تھے، گیان اور دھیان میں گم بیٹھتے تھے، وہ پرندہ اُن کے کاندھوں پر بیٹھ کر اُن کے کانوں میں وحدت کے گیت گاتا، چہکتا رہتا، ان کا مونس اور غم خوار ہو جاتا، تنہائیوں کی شیشہ گری کو اپنی چونچ سے کرچی کرچی کر دیتا..

اور پھر ایک ایسی شب آئی کہ چاندنی کے جزیرے حرا کے شگافوں میں سے اترے اور اُس کے فرش پر بچھ گئے.. چاند بجھ گیا، غروب کب کا ہو گیا لیکن چاندنی کے جزیروں کا وہ فرش بچھا رہا

کہ اُسے ایک یتیم اور بے آسرا شخص کے قدموں سے روندے جانے کی چاہت تھی، نہ اُسے باپ کا سایہ نصیب ہوا اور نہ اُس نے ماں کی آغوش کی حدّت کو محسوس کیا اور وہ پرندہ نہیں جانتا تھا کہ اس شخص کا سایہ کائناتوں پر محیط ہوگا اور اس کی آغوش میں ایک زمانہ روپوش ہوگا.. اور ایک ایسی شب نزول کی اتری جب اُس پرندے کو ایک صدا سنائی دی، حرا کے اندر چاندنی کے جزیروں کے بچھے قالین پر اُس کے وہ جُوتے دھرے تھے جن کی گانٹھیں اُس نے اپنے ہاتھوں سے لگا کر اُنہیں جوڑا تھا... پرندے کا ایک بُوند بھر دل اُس کے جوتوں کی ہر گانٹھ میں بندھ گیا، دھڑکنے لگا، گواہی دیتا گیا کہ یہی صادق ہے اور یہی امین ہے اور صدا اقراٗ کی آئی.. ہر گانٹھ میں بندھا اُس کا دل اقراٗ اقراٗ چہکنے لگا..

(ترجمہ) پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا

جس نے انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا

پڑھو، اور تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے

جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا

انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا

مگر انسان سرکشی کرتا ہے

اس لیے کہ وہ اپنے تئیں بے نیاز سمجھتا ہے

(سورۂ علق)

پڑھ، اعلان کر، خبر کر جو نامعلوم کے اندھیروں میں نابینا بھٹکتے ہیں اُنہیں معلوم کی خوش خبری سنا، انہیں بینا کر دے.. اُس کا بوند بھر دل اُس کے جوتوں کی گانٹھوں میں بندھا دھڑکتا تھا جب اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پوتر ریشم ایسے بدن میں ایک لرزش جنم لے رہی ہے اور ایک ڈر ہے کہ

کہیں یہ کوئی جادو تو نہیں تو وہ پرندہ گانٹھوں کے گھونسلے سے نکلا اور اُس کے کاندھے پر براجمان ہو گیا، اُسے ڈھارس دینے کی خاطر، اُس کے صادق اور امین ہونے کی گواہی دیتا.. وہ اُس کے کاندھے پر بیٹھا تو اُس کے بدن کی حدت سے اُس کے پنجے سُلگنے لگے اور اس سُلگاہٹ میں جو لطف تھے وہ اُس کا بوند بھر دل جانتا تھا.. کیا وہ اپنے کاندھے پر اُس کی موجودگی سے آگاہ تھا؟ بھلا جس پرندے کا دل ایک بوند ہو، اُس کا بوجھ کہاں اتنا ہوتا ہے کہ محسوس ہو سکے.. حرا کے غار کے باہر چاند اپنی منزلیں طے کرتا ڈھلتا تھا اور اُس کے پتھروں کے بیچ میں ایک وہ شگاف جو ابھی تک تاریکی میں روپوش تھا، چاندنی کا آخری جزیرہ اُس میں اترا، سفر کرتا اُس کے کاندھے پر براجمان پرندے کے مختصر سراپے پر مرکوز ہو گیا، نہ اُس کے بال و پر رہے اور نہ بوند بھر دل، وہ چاندنی کے نور میں ڈھل کر روشنی سے جیسے سُلگ اٹھا.. ایسے اُس کے نصیب تھے.. پر وہ بس دو پل کے لیے ہی یوں روشن چاندی میں ڈھلا ہوا ایک پرندہ ہوا، اگلے لمحے چاندنی کا جزیرہ چاند کے مزید ڈھلنے سے بجھ گیا..

وہ جبلِ نور سے اترا تو اُس کے دامن میں منتظر اُس کی اہلیہ نے اُسے ایک کمبل اوڑھا دیا... ان آڑے ترچھے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان میں جو کھوہ وجود میں تھی وہ اُس کا دوسرا گھر ہو گئی.. وہ وہاں آتا جاتا رہتا تھا لیکن اقرأ کی شب کے بعد جب کبھی وہاں قدم رکھتا تو اُس گپھا کے اندھیروں میں یکدم بے انت چراغ جل اٹھتے، ہر سُو روشنی ہو جاتی، وہی روشنی روزِ ازل کی جب اُس نے جب کہ پانیوں پر ایک رُوح تیرتی تھی، ایک دھند معلق تھی تو اُس نے اذن دیا تھا کہ روشنی ہو جا تو روشنی ہو گئی تھی، وہی روشنی.. پرندے کی آنکھیں مہین آنکھیں چندھیا جاتیں، وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اپنے شگاف گھونسلے میں سے نکل کر اُس کے پاؤں پر گر جاتا اور اُس کی بوسیدہ ہو چکی جوتیوں کی ہر گانٹھ میں اپنا دل رکھ دیتا... اقرا کے اُن زمانوں کو بیتے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں، جب وہ آخری بار آیا تھا تو اسے کیا معلوم تھا کہ یہ آخری بار ہے، اگر اسے علم ہوتا تو وہ اُس کی گانٹھوں میں بندھا اُس

کے ساتھ ہی جبل نور سے اتر جاتا..

چودہ سو برس تک وہ اُس کی جدائی کی آگ میں سلگتا اُس کا انتظار کرتا رہا پر اُس کے نصیب میں چاندنی کا آخری جزیرہ پھر دوبارہ نہ ہوا..اُس کے پنجے اُس کے بدن کی حدّت سے سلگنے کے لیے ترستے رہے، اُس کا دل ایک گانٹھ سے بندھ جانے کی آس میں تڑپتا رہا..وہ اتنی لمبی جدائی برداشت نہ کر پایا، اپنے شگاف گھونسلے میں سے نکلا، جبلِ نور پر بلند ہوا، خانہ کعبہ کے گرد ابابیلوں کا ایک غول اڑان کرتا تھا وہ اُن کے نرغے میں آنے سے بچتا اڑان کر گیا..

■•◆•◆•◆•■

بلخ کے آتش کدوں کی آگ کو سرد ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں، ازل سے روشن اور تاباں زرتشت کے ہاتھوں سے بھڑکی ہوئی آگ کو صحرا کے بدوؤں نے بجھا دیا تھا.. آہورا مزدا کی خدائی کا خاتمہ کر کے ایک اور صحرائی خدائی کا راج قائم ہو چکا تھا.. آتش کدے، سپر دآتش کب کے ہو چکے تھے.. لیکن اُن کی راکھ تو ابھی باقی تھی، ہزاروں برسوں سے جلنے والی مقدس آگ کو بجھا بھی دیا جائے تو اُس کی راکھ تو باقی رہتی ہے.. اور اُس راکھ میں ققنس کی مانند ایک پرندہ بھسم ہوتا رہا، پھر اُسی راکھ میں سے دوبارہ جنم لیتا رہا، وہی پرندہ جس نے ایک مدت زرتشت کے اونی لبادے کے اندر روپوش ہو کر جب کہ برفباری کی، انسان تو کیا چرند پرند کو بھی منجمد کر دینے والی رُتوں میں اُسے اپنے مختصر بدن کی حدّت سے گرمائے رکھا اور اُس پر ''اویستا'' کی صورت جو آسمانی آیات اُتری تھیں اُن کی قرأت کرتا رہا تا کہ وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں..

بے شک آتش پرست بلخ سے یوں نکالے گئے جیسے مدینے کے یہودی معاہدوں کی خلاف ورزی کی پاداش میں نکالے گئے لیکن وہ پرندہ ایمان نہ لا سکا، آتش پرستی سے تائب نہ ہوا اور بجھ چکی آگ کی راکھ میں مقیم، بھسم ہوتا اور دوبارہ زندہ ہوتا رہا.. موجود رہا.. اگرچہ ہر نئے جنم پر اُس کے پَر جلتے تھے لیکن.. ایک پرندہ کیا جو پَر جلا نہ ہو.. اور ایک دریا کیا جو بہتا نہ ہو.. اور ایک رانجھا کیا جو گن پھٹا نہ ہو اور ایک مرزا کیا جس کا ترکش جنڈ کی سب سے بلند شاخ پر ٹنگا نہ ہو.. اور ایک حلاج کیا جو اپنے لہو سے وضو نہ کرے.. اور ایک طاہرہ کیا جو بہاء اللہ کے عشق میں فنا ہو کر ایک اندھے

کنویں میں نہ گرائی جائے اور ایک عشق کیا جس کا کوئی انت نہ ہو اور ایک پیغمبری کیا جو لوگوں کے دُکھوں کا مداوا نہ کر سکے..... وہ پُرجلا پرندہ، کوہ طور کے جُھلسے ہوئے پرندے کی مانند، یوں ان گنت صدیوں سے بار بار مرتا اور بار بار نئے جنم لے کر زندہ ہوتا، بیزار ہو گیا.. حیات و موت کے اس تسلسل سے اُکتا گیا، وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے بلخ کے اُس آخری آتش کدے کی راکھ کو ترک کر کے اڑان کی تو یہ اُس کی آخری حیات ہوگی، وہ مر گیا تو دوبارہ نہ جی سکے گا اور اس کے باوجود، بیزار ہونے اُکتا جانے کے باوجود شاید وہ اپنی ابدی حیات کو داؤ پر نہ لگاتا.. اگر اسے بلخ کے کھنڈروں میں ایک عجیب ارتعاش سنائی نہ دیتا، اُسے خبر ہو گئی کہ اُس کے ہم جنس کوہ طور سے اتر رہے ہیں، بدھ کی پسلیوں میں سے، عیسےٰ کی صلیب کے شہتیروں میں سے، غار حرا کے شگافوں میں سے اپنے آشیانے ترک کر کے ایک اور سچ کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے ہیں.. چنانچہ اُس نے بھی اپنے بال و پر سے وہ راکھ جھاڑی جو اُسے بار بار زندہ کرنے پر قادر تھی اور بلخ کے کھنڈرات پر بُلند ہو گیا..

دنیا بھر میں جتنے بھی پرندے آسمانوں کو سجاتے ہیں، کچھ تخصیص نہیں کہ اُن کی نسل کیا ہے، وہ ناخن برابر ہیں یا اتنے بڑے کہ ایک چھوٹے سے قصبے پر سایہ کر دیں، سب کے اندر ایک ایسا نظام نصب ہوتا ہے جو انہیں آپس میں مربوط رکھتا ہے.. اگر قادر آباد کی جھیلوں میں تیرتی چار مُرغابیوں میں سے ایک پانیوں کو ترک کر کے پرواز کرتی ہے تو پوری دنیا کے پرندوں کو.. مہرانوں جنگل کی جھیل پر اترتی سینکڑوں مرغابیوں کو، الاسکا کے برفزاروں میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک عقاب کو.. کسی کیکر میں پوشیدہ ایک چڑیا کو.. یہاں تک کہ فیئری میڈو کے جنگل کے ایک مرغ زریں کو بھی خبر ہو جاتی ہے کہ قادر آباد کی جھیلوں میں سے ایک مرغابی نے اڑان بھر لی ہے.. تو اگر یوں دنیا بھر کے پرندوں کے دل ایک ہی دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں تو جونہی کسی ایک پرندے کے پَر اڑان کے لیے کھلتے ہیں تو وہ دھاگا ایک ساز کے تار کی مانند تن جاتا ہے اور کائنات کے سب پنکھ پکھیرو جتنے بھی ہیں ان

کے دلوں میں ایک کھینچ پڑتی ہے، خبر کرتی ہے کہ کلر کہار کی جھیل کے پانیوں سے ایک جل مُرغ ابھی ابھی اپنے پروں سے بوندیں جھاڑتا بلند ہوا ہے، خاص طور پر وہ سب پرندے جنہوں نے عطار کے نوکِ قلم سے جنم لیا ''منطق الطیر'' کے جمگھٹے میں شامل سی مرغ کے متلاشی، سلیمان کا رازداں ہُد ہُد جو اُن سب کا مُرشد اور قائد تھا.. کوہ طور کی وہ فاختہ جس نے مُوسٰے کی رفاقت میں اُس آگ کا نظارہ کیا، وہ طوطا جس کا گھونسلا جنت کے شجر میں پنہاں تھا اور وہ مرغابی جو اُس راستے کی مسافر ہوئی جو دنیا سے لپٹے پہاڑ قاف کی جانب جاتا تھا.. وحدت کے غار کا مکین عقاب، بلبل جو داؤد کے ہمراہ نغمہ سرا ہوتی تھی، آٹھ دروازوں والے جنت کے باغوں میں رقص کرتا مور.. کبوتر جو یونس کی مانند اپنی انا کی مچھلی کے پیٹ کے اندر نگلا گیا.. سب کے سب وحدت کے ایک ہی دھاگے میں بندھے، ایک ہی ڈور میں پروئے ہوئے اور اُس ڈور کو لُک چُھپ کے عطار کھینچتا ہے یوں کہ ہر پرندے کے دل میں یہ ڈور ایک گانٹھ باندھتی ہے جیسے کہ غارِ حرا کے فرش پر اُس کے جوتوں میں گانٹھی ہوتی ہے..

اگر یہ سب پرندے آپس میں بندھے ہوئے ہیں، ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک پرندہ بے خبری میں ایک تاریک کنویں میں پڑا رہتا.. جس میں وہ جو طاہرہ تھی، عشق کے جرم میں گلا گھونٹ کر گرا دی گئی.. وہ جو نکتہ بہ نکتہ، مُو بہ مُو، خانہ بخانہ، دربدر، کُوچہ بہ کُوچہ، کُو بہ کُو، دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جُو بہ جُو، غنچہ بہ غنچہ، گُل بہ گُل، لالہ بہ لالہ، بُو بہ بُو، طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خُو بہ خُو، رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پُو بہ پُو اور صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تُو، قرۃ العین طاہر جو خاتونِ عجم تھی..

کعبہ تُوئی صنم تُوئی دیر تُوئی حرم تُوئی
دلبرِ محترم توئی، عاشقِ بے نوا منم..

وہ ہمیشہ سے طاہرہ کی پاک دامنی کے گواہ کے طور پر اُس کے لبادے میں یوں بُنا ہوا تھا جیسے سُوت کے دھاگوں میں ریشم کا ایک نغمہ گر دھاگا وحدت کے رنگیلے کھیس میں بُنا اپنی چھب دکھلاتا ہے..

تُو و مُلک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری
اگر آن نکوست تو درخوری، وگر ایں بداست مرا سزا

انہوں نے طاہرہ کا گلا گھونٹ کر اُسے ایک اندھے کنویں میں گرا دیا..اور نہ جان سکے کہ اُس کے پیراہن میں پرویا ہوا ایک پرندہ اُس کے شعروں کا حافظ ہے، اُس کے گلے میں جو گھونٹا نہ جا سکا طاہرہ کا دیوان ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکا ہے..وہ سب جو کنوؤں میں گرائے جاتے ہیں، اگر یوسف ہوں تو کسی قافلے کے مسافر اُس میں جھانک لیتے ہیں، اگر پُورن ہوں تو کوئی جوگی بالناتھ اُدھر آ نکلتا ہے اور اگر وہ طاہرہ ہوں تو اُس کنویں میں کوئی نہیں جھانکتا کہ اُس کا ایک جرم تو عورت ہونا تھا اور پھر اُس نے مروجہ رسم دین سے بغاوت کر کے آسمانی کتابوں سے انکار کیا اور بہاء اللہ کے عشق کی کتاب پر ایمان لے آئی..تو وہ ایک پرندہ جو اُس کے پیراہن میں بُنا ہوا ایک نغمہ گر دھاگا تھا اُس نے اپنے آپ کو اُس پیراہن سے جدا کیا کہ وہ کب کا بوسیدہ ہو چکا تھا، طاہرہ کے بدن کی ہڈیاں خاک تو ہو چکی تھیں پر کنویں کے اندھیرے میں کبھی کبھار اُن ہڈیوں میں سے عشق کی کوئی ایک چنگاری پھوٹتی، انکار اور عشق کی کوئی ایک چنگاری پھوٹتی..

در رہ عشقت ای صنم شیفتۂ بلا منم
چند مغایرت کنی، باغمت آشنا منم

اندھے کنویں میں ایک جگنو دمکتا اور پھر تاریکی لوٹ آتی..

وہ پرندہ بھی جب عشق کی ایک اور چنگاری نے اندھیاروں کو چاک کیا تو پھڑ پھڑاتا ہوا کنویں سے نکلا کہ اُسے بھی تو خبر ہو گئی تھی، اور کنویں کے اوپر جو نیلے افلاک تنے ہوئے تھے اُن میں چھید کرتا پرواز کرتا گیا..

وہ ہمیشہ سے حلّاج کی صحبت میں نہ رہا تھا، وہ تو دنیا کے ہر لباس سے عاری تھا، اُس کا کوئی پیراہن ہوتا تو وہ اُس میں بُنا ہوتا.. موت کی زردی برحق ہے لیکن "انا الحق" کے پرند جن کے اندر کُوکتے ہیں وہ اپنے بریدہ بدن میں سے پھوٹتے لہو کو اپنے چہرے پر مل کر اُسے لال گلال کر لیتے ہیں اور اُسی لہو سے وضو کر کے اپنی نمازِ عشق ادا کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں، حلّاج کے لوتھڑے کو بھی نذرِ آتش کر کے اُس کی راکھ دریائے فرات میں بہا دیا گیا.. اُس پرندے نے اُسی راکھ میں سے جنم لیا تھا اور جب اُس کے دل میں بھی ایک گانٹھ پڑی، ایک ڈور کھینچی گئی تو اُسے بھی خبر ہو گئی.. وہ فرات کے پانیوں سے اٹھا، حلّاج کے لہو میں نچڑتا بلند ہوا یوں کہ جہاں جہاں سے وہ پرواز کرتا گزرتا، اُس کے پروں تلے سرکتی زمین پر لہو کی بوندیں گرتی گئیں، انا الحق کے سرخ پھولوں کی فصلیں پُھوٹتی گئیں.. لیکن سب کی سب سر بریدہ..

وہ سات پرندے اپنے اپنے زمانوں کی قید سے نکلے، وقت کے بہاؤ کے باغی ہوئے، ہر پرندے کا اپنا اپنا آسمان تھا، سات پرندوں کے حصے میں پورے سات آسمان آئے اور کسی بھی پرندے کی وراثت میں آیا ہوا آسمان کسی اجنبی پرندے کو اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ اُس کی حدود میں شامل ہو کر اُڑان کرے، اُس کے اندر ازل سے جو بھید پوشیدہ ہیں اُن تک رسائی حاصل کرے کہ یوں خدشات کے بہت سے در چوپٹ کھلتے جاتے تھے اور ہر در کے پیچھے اُسے اپنا آپ دکھائی دینے

لگتا تھا، راز افشاء ہو جاتا تھا کہ یہ جو ہر پرندہ اپنے آپ کو ہی آخری سچ سمجھتا تھا اُس کے سچ کے سوا اور بھی سچ ہیں اور اس راز کے افشاء ہونے سے بہت سی پیچیدگیاں جنم لے سکتی تھیں کہ اگر سچ کسی ایک پرندے کے پروں کی پوٹلی میں بندھا ہوا تھا تو کیا وہ کافی نہ تھا، بقیہ پرندے کیوں تخلیق کر کے اتارے گئے اور اُنہیں اذن پرواز ملا..

جب یہ سات پرندے اپنے اپنے گھونسلوں اور مسکنوں میں سے نکل کر اپنے اپنے آسمانوں میں مائل پرواز ہوئے.. اپنے زمانوں کی قید میں سے فرار تو نہ ہوئے بلکہ کسی ایسی قوت نے جو اُن آسمانوں میں ایک نادیدہ برقی رُوح کی مانند سرایت کرتی تیرتی تھی، اُس نے انہیں اپنے اپنے زمانوں سے دھکیل کر تمام سرحدوں کے پار آج کے زمانے میں داخل کر دیا اور یوں وہ اپنے اپنے آسمانوں سے نکالے گئے اور ایک نئے آسمان کے مسافر ہو گئے

وہ ساتوں آپس میں ٹکراتے ٹکراتے بچے.. ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے کہ من تُجا تُو مُجا.. اگرچہ اُن کے اندر جو خودکار خبر رساں نظام متحرک تھا، انہیں خبردار کر چکا تھا کہ تمہارے سوا اور بھی پرندے ہیں جو اس لمحے اڑان کر چکے ہیں، اُن کی قربت کی اُنہیں لمحہ بہ لمحہ خبر ملتی چلی گئی تھی اور یہ ملاقات متوقع تھی لیکن اس کے باوجود وہ ساتوں ٹھٹک گئے.. اپنے علاوہ سچ کے اور مظاہر کو سامنے پا کر دنگ رہ گئے..

ان میں ہُد ہُد کونسا تھا جو پیر مغاں تھا، مُرشد اور راہنما تھا.. کوہ طور کی پرجلی فاختہ کونسی تھی.. طوطا، بلبل، مرغابی اور عقاب کون کون تھے.. یہ طے نہ ہو سکتا تھا.. البتہ یہ طے تھا کہ وہ ساتوں اپنی قدامت اور بوسیدگی کے بال و پر جھاڑ کر جستجو اور حیرت کی نئی منزلوں کے تازہ پروں کے ساتھ اپنے من کی موج سے گھر سے بے گھر ہوئے تھے.. اور یہ بھی طے تھا کہ وہ عطار کے پرندے نہ تھے کہ وہ کب کے اپنے سچ اور بادشاہ سی مرغ کے ساتھ راکھ ہو چکے تھے اور ان پرندوں نے اُسی راکھ سے

جنم لیا تھا گویا یہ عطار کے پرندوں کے اوتار اور مظہر تھے، دوبارہ متشکل ہو چکے تھے.. اُن پروں کی پوٹلیوں کے اندر حدّت بھرے بوند برابر سات دل تھے وہ بری طرح دھڑکے اور ہر دھڑکن سوال کرتی تھی کہ اب کدھر، اب کدھر.. بے شک وہ اصل نہ تھے، اصل کے مطابق ایک نقل تھے لیکن اُن کے اندر وہ جو دل تھے وہ جوں کے توں اصلی حالت میں ایک تسلسل میں چلے آئے تھے اور اب کدھر کے سوال پر ایک ہی جواب آتا تھا..

نیشاپور..

نیشاپور..

اور وہاں سے کہاں؟

قاف کا پہاڑ جو اس دنیا سے لپٹا ہوا ہے.. جہاں ایک مرتبہ پھر سی مُرغ ہمارا منتظر ہے، ہماری راہ دیکھتا ہے، ایک پردے کے پیچھے روپوش ہماری آمد کی گھڑیاں گنتا ہے کہ بے شک ایک آخری سچ ہو لیکن اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ بار بار اُس پر مُہر لگتی رہے کہ ہاں تم ہی آخری سچ ہو اور اگر ایک مدت تک وہ مُہر نہ لگے، زمانے بیت جائیں اور کوئی بھی گواہی دینے نہ آئے تو وہ سچ متروک ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اُس سے منسلک خدا بھی تاریخ کے کباڑ خانے میں کُوڑا ہو جاتے ہیں کہ خداؤں کا وجود صرف اُن کے پجاریوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے.. پجاری نہ رہیں اور ان کے چرنوں میں پُھول چڑھانے والا کوئی نہ رہے تو وہ اس اکلاپے کی تاب نہیں لا سکتے، اپنے قدموں پر مسمار ہو جاتے ہیں اور اُن کی جگہ لینے کے لیے نئے خدا جو منتظر ہوتے ہیں اُن کے مسمار ہونے کے، آ جاتے ہیں..

تو کیا ہم ساتوں ایک مرتبہ پھر قاف کا قصد کریں..

ہم جن پرندوں کی راکھ میں سے پھڑ پھڑاتے نمودار ہوئے ہیں، اُن کے ہم شکل ہیں تو کیا

زمانے جب بہت زمانے ہو گئے ہیں تو آج بھی قاف کا قصد کریں.. کدھر جائیں.. جائیں تب بھی مشکل، نہ جائیں تب بھی مشکل اور تب وہ سات پرندے جن کے بوند برابر دل ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے، اُس ڈور کو روئی دھنکنے والے پنجے نے دھنکا.. وہ ساتوں پرندے گویا روئی کا ایک ڈھیر تھے جنہیں اُس ڈور کے اِکتارے پر دھنکا جا رہا تھا.. من تُو شدی تو من شُدی.. وہ ساتوں یوں دھنکے جانے سے اپنی اپنی پہچان کھو بیٹھے، اُن کی ذات کے ذرے روئی کے گالوں کی مانند اڑنے لگے..

انہوں نے اپنے اپنے آسمان کھو دیئے اور اب اپنی شناخت کو بھی کھوتے چلے جا رہے تھے.. روئی دھنکنے والے دھنیا کا اکتارا جو اُس ڈور سے بندھا ہوا تھا جس نے اُن کے بوند برابر دلوں کے گرد گانٹھ لگائی ہوئی تھی، رُوں رُوں کرتا سرگوشیاں کرتا تھا، انا الحق کا ورد کرتا تھا..

تو اگر قاف کا قصد نہ کریں تو کدھر جائیں، کوہ طور اور جبل نور کے سوا کس بلندی کو اپنی آنکھوں میں تصویر کر کے اپنی اڑان کا رُخ منزل کریں..

دُھنک دُھنک دم دُھنک..

تُو نباؤ جدا ناں یار بناں..

دِن دسمبر کے تھے..

جتنی بھی الوہی بلندیاں ہوتی ہیں، جبلِ نور کی ہوتی ہیں یا طور کی، اُن پر چڑھنے کے لیے کوئی بھی آمادہ آسانی سے نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے آمادہ کیا نہ جائے، کسی جھاڑی کو اُس کے قلب میں سلگایا نہ جائے، چاندنی کے جزیرے اُس کی آنکھوں کے شگافوں کے راستے دل کے طاقچے میں ایک چراغ نور کا روشن نہ کریں..اس کے باوجود کوہ پیمائی کے لیے، بلندیوں پر چڑھنے کے لیے ایک سکت تو درکار ہوتی ہے، جو مُوسٰے حسین میں کم ہوتی جا رہی تھی، اُس کی آنکھوں میں جو دُھندلاہٹ اتر رہی تھی وہ منظروں کو چاہے وہ تیز دھوپ میں عیاں اور برہنہ ہوں، دھوپ کی ایک چادر میں یوں ملفوف کرتی تھی کہ وہ حقیقت سے واہموں کی جانب ملتفت ہوتے جاتے تھے..

وہ ایک ایسا شجر تھا جس کی شاخوں میں جتنے بھی پتے پھوٹنے تھے وہ سب پھوٹ چکے تھے، جن میں ہریاول کے رنگ یوں نچڑتے تھے کہ اُس کے تنے کے گرد کا کینوس سبزے کی ایک تصویر ہو جاتا تھا، اور اب ایک مدت سے کسی ایک پتے میں سے بھی ہریاول کا ایک قطرہ نہ ٹپکا تھا، گویا قوت نمو کی مردانگی کے جوہر کب کے خشک ہو چکے تھے اور اب وہ ہریاول سے خزاں کے اُس سنہرے پن کی جانب مائل تھے جو محض یا تو طلوع آفتاب کی پہلی کرنوں کی زردی کے وصال سے یوں دمک اٹھتے تھے جیسے انکا تہذیب کے کھنڈروں میں سے دریافت ہونے والا کوئی قدیم زیور اور جونہی دھوپ میں شدت آتی اُس شجر کے سب پتے اپنی سنہری دمک کھو بیٹھتے..محض خزاں کے منتظر ایسے پتے

ہو جاتے جنہیں فنا کے اُس جھونکے کا انتظار تھا جو کسی بھی لمحے ٹلّہ جوگیاں کے نشیب میں واقع دُھند میں ملفوف دریا کے بہاؤ میں سے جنم لے کر بلندی کی جانب شرلاٹے بھرتا آتا اور انہیں ڈال سے جدا کر دیتا اور ہاں وقت غروب میں پل دو پل کے لیے ان پر زرد رنگت کی ایک دل فریبی ایسی اترتی جیسے محبوب سے بچھڑ جانے والوں کے چہرے زرد ہوتے ہیں..

دن دسمبر کے تھے او مُوسٰے حسین نام کے شجر کے خزاں رسیدہ پتے اُس جھونکے کے منتظر تھے..

مُوسٰے کا وہ بدن جو کبھی ایک ایسے جلوے کو بھی سہار گیا تھا جس نے پورے جبل کو راکھ کر دیا تھا، سُرمہ بنا دیا تھا، چڑھائی کی مشقت سے مسمار ہوتا جاتا تھا، پسینے میں بھیگا ہوا تھا، اُس کے کانوں میں فنا کی سیاہ چمگادڑوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اترتی تھی..

وہ بے اولاد تھا..

ابھی کچھ عرصہ پہلے اُس نے پُورن کے کنویں میں جھانکا تھا، اُس کے پاتال میں نہ یوسف تھا اور نہ پُورن، بھر بھری سرخ اینٹوں کی گولائی میں گھرے ہوئے وہ پانی تھے جو اُس کی تہہ میں سے ہزاروں برسوں سے بوند بوند پھوٹتے تھے، کٹاس راج کے تالاب کی مانند شو کے ایک آنسو کی شکل میں، آسٹریلیا کے صحراؤں میں بلند ہونے والی عظیم چٹان کے دامن میں ابلتے اُس تالاب کی مانند جس کے بارے میں ابورجنل لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جس روز کائنات تخلیق ہوئی، اُسی روز یہ تالاب وجود میں آیا اور آج تک خشک نہیں ہوا.. چاہِ زمزم کے پانیوں کی مانند جو آج بھی ٹھہرتے نہیں، ٹھہر ٹھہر، پر وہ اُبلتے جاتے ہیں، یوں پُورن کے کنویں کے پانی بھی تھے، بھر بھری سرخ اینٹوں کی گولائی میں گھرے اور اُن کی سطح پر گلاب کی پتیاں تیرتی تھیں جو کسی بانجھ عورت نے اپنے دل کی مراد، اولاد کی مراد کی منت میں کنویں میں گرائی تھیں..

وہ تو ان اوہام اور جادو ٹونوں پر یقین نہ رکھتا تھا. تو وہ کیوں پُورن کے کنویں کی یاترا کے لیے چلا آیا..

کوئی بھی شخص، بصیرت اور بصارت کا دعویٰ کرنے والا.. اپنے اعتقاد پر مستحکم، دلیل پر یقین رکھنے والا بے شک آکسفورڈ اور کولمبیا سے تعلیم یافتہ جب کبھی یونہی زندگی آرام سے بسر کرتے کسی ناگہانی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے جو اُس کے گمان میں نہیں ہوتی تو اول اول وہ اس کا سامنا بے جگری اور منطق سے کرتا ہے اور جب کوئی بھی علاج چارہ گر نہیں ہوتا تو وہ مجبور ہو کر ایسے ایسے تواہمات کا سہارا لیتا ہے جن کی شنید پر وہ کبھی طنزیہ انداز میں مسکرا دیا کرتا تھا. موت سے پناہ حاصل کرنے کے لیے، ایک لاعلاج مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر وہ ہر اُس دروازے پر دستک دیتا ہے جس کے پیچھے سوائے شرک اور اوہام کے گِدھوں کے اور کوئی نہیں ہوتا.. اور وہ جن کے نصیب میں اولاد نہیں ہوتی، وہ کہاں کہاں فریاد نہیں کرتے، کیسے کیسے احمقانہ پاپڑ بیلتے ہیں، مزاروں کی جالیوں کے شگافوں میں خواہشوں کے دھاگے باندھتے ہیں، قدیم برگدوں کے تنوں میں دیئے جلاتے ہیں... یہاں تک کہ دم درود کے لیے اپنی اہلیہ کو کسی جعلی پیر کی خلوت میں بھی بھیج دیتے ہیں..

مُولے حسین نامرد ہرگز نہ تھا.. اُس کے جرثوموں میں نمود کی افزائش تو تھی جو سر سراتی تھی اور پھر دم توڑ دیتی تھی..

اولاد کی وحشت میں اُس نے بھی بہت کشٹ کاٹے.. اپنی تمام تر روشن خیالی کو شرمندگی سے ترک کر کے اُس نے شیخوپورہ کے ایک تاریخی مزار پر منت کے طور پر لکڑی سے تراشیدہ ایک لنگ چڑھایا اور وہ بزرگ لنگ شاہ کہلاتے تھے.. اور جب اتنی کاوشوں کے باوجود اُس کی اہلیہ کی کوکھ میں سے کچھ بھی نہ پُھوٹا تو اُس کی تصویروں کی مداح ایک خوش بدن عورت نے جو اکثر اُس کے لیے بخوشی

نیوڈ ماڈلنگ کرتی تھی اُسے مشورہ دیا کہ سَر ..آپ جانتے ہیں کہ میں کچھ مہینوں سے آپ کے لیے نیوڈ ماڈلنگ سے اجتناب کرتی ہوں، اس لیے کہ میں بیس برس کی کاوشوں کے بعد حاملہ ہوگئی ہوں..کچھ حرج نہیں اگر آپ بھی ہوآئیں..تو مُوسےٰ حسین نے راجہ رسالو کے شہر سیالکوٹ کا سفر اختیار کیا، شہر سے دور ہندوستان کی سرحد کے کناروں پر، ابھی تک موجود وہ پُورن بھگت کے کنویں تک گیا.. ابھی تک پوجے جانے والے پانیوں تک پہنچا..

مصر کی زلیخا کی مانند، پُورن کی سوتیلی ماں لُوناں بھی اپنے سوتیلے بیٹے کے حسن و جمال پر مرمٹی..اور جب پُورن نے یوسف کی مانند دامن چھڑانا چاہا تو اُس نے طیش میں آکر راجہ رسالو سے رودھو کر فریاد کی کہ تمہارا بیٹا میرے اُس بدن کو پامال کرنا چاہتا ہے جو تمہاری امانت ہے..راجہ رسالو نے پُورن کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اُسے ایک اندھے کنویں میں گرا دیا.. یوسف اور طاہرہ کی مانند پُورن کے نصیب میں بھی تمام طاہر اور سچے لوگوں کی مانند ایک کنواں تھا..پھر زمانے بیت گئے اور وہاں سے ٹلہ جوگیاں کے کچھ کن پھٹے جوگیوں کا گزر ہوا.. بالناتھ جوگی نے اُسے کنویں سے نکال کر اُس کے ہاتھ پاؤں بحال کیے اور اسے اپنے ہمراہ ٹلہ جوگیاں لے گیا.. پُورن کے گیان دھیان نے اُسے ایک بھگت کا روپ دیا..وہ واپس سیالکوٹ آیا تو لُوناں اُس کے پاؤں پڑ گئی اور اُس کی دعا سے لُوناں کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا..

پُورن اولاد دینے والا بھگت تھا..

ملک تقسیم ہوگیا، ذات، برادری، قبیلے اور مذہب تقسیم ہوگئے لیکن..آج بھی عورتیں پُورن کی کرشمہ سازی پر یقین رکھتی، اولاد کی خواہش میں بندھی چلی آتی ہیں..وہ اُس کے کنویں میں جھانکتی ہیں، گلاب کی پتیاں گراتی ہیں، اُس کے پانیوں سے اشنان کرتی ہیں، اور پھر اپنے وہی کپڑے دوبارہ زیب تن نہیں کرتیں جو وہ پہن کر آئی تھیں، اُن پیراہنوں کو نذرِ آتش کر کے نئے

جوڑے پہنتی ہیں اور.. اُن میں سے بیشتر کنویں کے برابر میں جو ایک سادہ سا مندر ہے، اُس کے فرش میں نقش یُونی کی شبیہ پر بیٹھ کر اُسے اپنی یُونی سے چھوتی ہیں..

مُوئے کی اہلیہ صفورہ شیر دل نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلے کے بعد پہلے دن پہلی کلاس میں مُوئے حسین کے لیکچر کے دوران، اُس گھنے بالوں اور کرخت چہرے کے مالک شخص کہ جس کی ناک ایک عقاب کی مانند تیکھی تھی، جس کی آنکھوں میں نیلاہٹ کے پرتو تھے اور اُن میں کسی عارضے کے باعث بار بار نمی آتی تھی جسے وہ لیکچر کے دوران مسلسل ایک ٹشو پیپر سے پونچھتا تھا، پر مرمٹی.. یہ عشق یک طرفہ تھا کہ مُوئے تب اپنی ذات اور مصوری کے تکبر کی چٹان میں قید تھا. صفورہ کو اس چٹان کو اپنی خوش شکل نازکی اور عشق کے پاگل پن کے تیشے سے تراشنے میں تین برس لگ گئے اور تب بھی منصورہ نے پہل کی اُس کے کھدر کے کُرتے کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر بولی.. مُوئے مجھ سے شادی کر لو.. ہمارے معاشرے میں جہاں ایک مرد بھی لڑکی کو شادی کی پیشکش کرتے ہوئے جھجکتا ہے وہاں اگر ایک لڑکی نہایت بے دھڑک ہو کر بے حیائی سے کہہ دے کہ.. مجھ سے شادی کر لو.. تو یہ ایک نہایت مہلک اور جان لیوا پیشکش ہوتی ہے جس سے نہ صرف مرد کی انا کو تسکین ملتی ہے بلکہ وہ فوری طور پر ایک صدمے کی کیفیت میں سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے...

صفورا شیر دل کی تصویر کشی کی اہلیت محدود تھی، اگرچہ اُس نے آسانی سے اس شعبے میں ڈگری حاصل کر لی تھی لیکن متعدد ذاتی نمائشوں کے باوجود وہ ایک مصور کے طور پر نمایاں نہ ہو سکی اگرچہ مُوئے حسین نے اُس کی تشہیر اور توصیف کے لیے اپنے تمام تر ذاتی روابط بے دریغ استعمال کیے.. وقتی طور پر اُس کا شہرہ ہوا اور پھر مصوری کے تذکروں میں اُس کا نام اگر آتا تو صرف مُوئے حسین کی اہلیہ کے طور پر اور یوں وہ کسی حد تک گمنامی میں اتر گئی. صفورا شیر دل نے ناکامی کی اس کسک کو کم کرنے کے لیے اخباروں میں پاکستانی مصوری کی صورت حال پر نہایت تفصیلی تنقیدی

مضامین لکھنے شروع کر دیئے اور یوں وہ کسی حد تک فنونِ لطیفہ کی دنیا میں اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئی.. لیکن یہ ابتدائی برسوں کی روئداد ہے، ہولے ہولے اُس نے مصوری کی دنیا سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے آپ کو ایک عام پاکستانی ہاؤس وائف کے طور پر قبول کر لیا.. اور یہاں بھی وہ ثمر آور نہ ہوسکی.. تخلیقی جوہر کے معاملے میں بانجھ رہی، بے اولاد رہی.. وقت گزرنے سے صفورا شیر دل جو کبھی چلبلی اور شوخ ہوا کرتی تھی، ایک چڑچڑی اور بات بات پر مشتعل ہونے والی بدزبان عمر رسیدہ عورت ہوتی گئی..

مُوسٰے حسین ابھی تک آرزومند تھا، اُس نے جب پُورن کے کنویں کی یاترا کے لیے اُسے مائل کرنا چاہا تو وہ پھٹ پڑی..

"بُل شٹ.. تم مجھ سے یہ توقع کرتے ہو کہ میں کسی گاڈ ڈیم پُورن کے فلنگ کنویں کے پانیوں سے غسل کر کے، اپنی شلوار اُتار کر کسی مندر کے فرش پر نقش یُونی پر بیٹھ کر اُس سے اپنی یُونی کو مَس کروں گی.. بُل شِٹ.."

مُوسٰے تنہا آیا..

پُورن کے کنویں کی چار دیواری کے نزدیک جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں سے اُن سلگتے پیراہنوں میں سے دھواں اٹھتا تھا جو اولاد کی خواہش کرنے والی عورتوں نے اشنان سے پیشتر اُتار پھینکے تھے، انہیں نذرِ آتش کر دیا تھا.. مُوسٰے نے کنویں کی منڈیر سے اُس کی گہرائی میں آنکھیں اتاریں، پانیوں پر گلاب کی پتیاں مُردہ بیر بہوٹیوں کی مانند بے جان تیرتی تھیں..

ہدایت نامے جتنے بھی افلاک سے اترے، مذاہب جتنے بھی دھرتی کی کوکھ میں سے خودرو

بُوٹوں کی مانند پھوٹے، روایت، ثقافت اور رہن سہن کے طریقوں میں سے جنم لیا اُن سب میں بلاتخصیص آس امید کا ایک چراغ پھر سے روشن ہونے کی نوید اس لیے دی گئی ہے تا کہ پیروکار اگر سینکڑوں برسوں کی ریاضتوں، عبادتوں اور چلّوں کے باوجود گوہر مقصود حاصل نہ کر سکیں تو کہیں برگشتہ نہ ہو جائیں، ایک گنجائش رکھ دی گئی جس میں سراسر انتظار تھا، ایک اور ظہور کا۔۔تا کہ لوگ مایوس ہو کر انکاری نہ ہو جائیں، منہ موڑ کر نہ چل دیں۔۔۔ایک مہدی ظاہر ہوگا۔۔جو بدی کے سلطنتوں کو مسمار کر دے گا۔۔کُل خلقت صرف اُس کے عقیدے کی پیروی کرے گی اور سب دُکھ مٹ جائیں گے۔۔نہ صرف امام مہدی کا ظہور ہوگا بلکہ حضرت عیسےٰ آسمانوں سے اتر کر مسیح موعود ہوں گے اور کُل دنیا کے لوگ اس الوہی چرواہے کی بھیڑیں ہو جائیں گے۔۔بودھی ستوا کی صورت میں ایک اور مہاتما بدھ خلق خدا کے وہ دُکھ جو کُل جگ کے ہیں، دور کرنے کے لیے پھر سے اپنا مُکھ دکھلائیں گے۔۔کرشن مہاراج کی بانسری کی مدھر دُھن پھر سے سنائی دے گی۔۔

''مقدس کتاب تلمود میں درج ہے کہ موجودہ عہد کی کل میعاد چھ ہزار برس ہے اور اس کے بعد ہم یہودیوں کے مسیح موعود نے آنا ہے۔۔اس وعدے کے پورا ہونے میں سوا دو سو برس رہ گئے ہیں۔۔پھر ساری دنیا یہودی بن جائے گی۔۔سلطنت داؤد اپنی قدیم شان و شوکت کے ساتھ پھر سے قائم ہو جائے گی۔۔ہیکلِ سلیمانی عین اُس جگہ تعمیر ہونا ہے جس ٹیلے پر مسجد اقصےٰ قائم ہے۔۔مسیح موعود کی آمد سے پیشتر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔۔''

اور پیروکاروں کو مایوسی سے بچانے کی خاطر اس گنجائش میں کچھ حرج نہیں، یہ موہوم امید کے وہ چراغ ہیں جو کبھی نہ کبھی تو جل اٹھیں گے۔۔ان میں اپنے اپنے مذہب کی پختگی کا اور اُس کے واحد الوہی سچ ہونے کے یقین کامل کا تیل ڈالتے رہتے، یہ کبھی نہ کبھی تو جل اٹھیں گے۔۔جب خلقت تمام صرف ایک عقیدے کی پیروکار ہو جائے گی۔۔لیکن کس ایک عقیدے کی؟ اس عقدے

کے وا ہونے کے لیے کچھ انتظار کرنا ہوگا.. اگر کوئی چراغ جل اٹھا تو..

یوں آج تک نہ کسی نے تحقیق کی اور نہ ہی اس بھید سے آگاہ ہونے کی جستجو کی کہ ہر دور میں مہدی یا مسیحا کا ظہور ہو نہ ہو، جیسے کوئی نہ کوئی قطب موجود ہوتا ہے ایسے کوئی نہ کوئی حلاج بھی موجود ہوتا ہے.. اور یوں پرکھ کیجئے تو راجہ سلوان کا بیٹا پُورن اپنے عہد کا حلاج اس لیے ٹھہرتا ہے کہ اُس نے بھی ''میں ہی حق ہوں'' کا نعرہ بلند کیا، سوتیلی ماں رانی لُوناں کے دامن کو دریدہ نہ کیا جس کی پاداش میں حلاج کی مانند اُس کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیئے گئے، وہ صلیب پر نہ چڑھایا گیا، ایک کنوئیں میں اپنے بھائی یوسف اور بہن طاہرہ کی مانند دفن کیا گیا..

■•◆•◆•◆•■

بازاورادر جہاں انداختن

نقش اوّل بجاں انداختن

پہلے اس (خدا کا نقش اپنی جان (روح) پر ڈالنا اور پھر اس نقش کو دنیا پر بچھا دینا

جنتِ ملاے و حور و غلام
جنتِ آزاد گاں سیرِ دوام

جنتِ ملا خورو خواب و سرود
جنتِ عاشق تماشائے وجود

علم ترساں از جلالِ کائنات
عشق غرق اندر جمال کائنات

ملا کی جنت شراب حور اور غلام

آزادگان کی جنت سیر دوام

ملا کی جنت کھانا پینا سونا موسیقی وغیرہ..

عاشق کی جنت حق کا دیدار

علم کائنات کے جلال سے خائف ہے

عشق کائنات کے جمال میں غرق ہے

(اقبال)

''عشق کا عروج کیا ہے؟'' حلّاج نے بغداد کے جُنید سے پوچھا..

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو..تم بغاوت پر آمادہ ہو..اپنی ذاتی شریعت تخلیق کر کے اپنے عشق

کے چراغ جلاتے ہو، تم نہیں جانتے؟''

''نہیں مجھے کچھ خبر نہیں..''

''تم جانتے ہو.. مجھ سے مکر کرتے ہو.. یہ سوال تمہاری برگشتگی اور مجذوبیت کی بے راہروی میں سے جنم لیتا ہے.. تم جانتے ہو..''

تب حلّاج نے کہا ''میں تو اتنا جانتا ہوں کہ عشق کا عروج اے جنید بغدادی تُو کل بھی دیکھے گا، پرسوں اور پھر اُس سے اگلے روز بھی مشاہدہ کرے گا.. انتظار کر.. تو جان جائے گا کہ حلّاج کے عشق کا عروج کیا ہوتا ہے..''

جنید بغدادی، حلّاج کے جذب کا قائل اور گھائل پر شریعت کے معاملات میں اٹل، نظریات جو طے تھے اُن سے ذرہ بھر انحراف قابل گردن زدنی قرار دینے والا اور عقیدے کے اندھے کنویں میں سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں مقدس پانی بھرنے والا، اُس کیچڑ کو خاطر میں نہ لانے والا جو صدیوں کے تعصب کے نتیجے میں کنویں کی تہہ میں بیٹھ چکا تھا، پانیوں کو گدلا کر رہا تھا وہ بلاشبہ ایک آسمانی عظمت والا فقیہہ تھا تو وہ بھی قائل اور گھائل ہونے کے باوجود اُن علماء کرام کے شانہ بہ شانہ کھڑا تھا جنہوں نے بھٹک چکے حلّاج کے قتل کا فتویٰ دیا تھا.. روایت ہے کہ جس کل میں حلّاج کو سُولی پر چڑھایا جانا تھا، حلّاج کو نہیں اُس کے ہاتھ پاؤں قلم کر کے اُس کے لوتھڑے کو صلیب پر لٹکایا جانا تھا، اُس کل کی شب میں جنید اپنے حجرے میں ایک پشیمانی کی حالت نیند کے لیے ترستا رہا، کچے فرش کو ندامت اور پچھتاوے کے آنسو گیلا کرتے رہے..

وہ کل آیا... جس کا وعدہ حلّاج نے کیا تھا کہ تم تب عشق کا عروج دیکھو گے... فقیہانِ بغداد

کے فیصلے کے مطابق اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے شہر کے گلی کوچوں میں گھسیٹا گیا جب کہ خلقتِ شہر دشنام کرتی، اُس پر تھوکتی، سنگ برساتی تھی.. وہاں کون تھا جو سوال کرتا کہ پہلا پتھر کون مارے گا کہ پتھروں کی اتنی یلغار تھی کہ اُن میں شناخت کہاں ہوتی کہ ان میں سے پہلا کونسا ہے.. پہلا پتھر، ہمیشہ بے شناخت ہوتا ہے اس لیے بھی کہ وہ مجرم محسوس کرتا ہے، اپنے پتھر دل میں قائل نہیں ہوتا کہ میں جس کی جانب پھینکا جا رہا ہوں، کیا اُسے واقعی سنگسار کر دینا چاہیے، پھر اُسے جلا کر اُس کی راکھ کو بھی اڑا دینا چاہیے.. پہلا پتھر ہمیشہ ایک مخمصے میں مبتلا رہتا ہے، وہ فیصلہ نہیں کر سکتا اور یوں اُس کے اندر ایک طیش جنم لیتا ہے جو اُس کے مجرم ہونے کی گواہی دیتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر اُس نشانے کی جانب ایک شہابِ ثاقب کی مانند گرتا چلا جاتا ہے اور ہمیشہ.. سب سے زیادہ خون کا خراج یہی پہلا پتھر حاصل کرتا ہے.. اور کہیں نہ کہیں کوئی عیسائی جوڑا، کوئی غیر مسلم، کوئی حافظ قرآن، کوئی منگول ناک والے ہزارے بچے یا کوئی مشال حسین اُس کی زد میں آ کر یوں بُھس کی مانند کچلا جاتا ہے جیسے ابرہہ کی فوج ابابیلوں کے کنکروں سے بھس کی مانند ہو گئی تھی... انکار اور اقرار کا جب تک قضیہ طے نہ ہو تب تک یہ پہلا پتھر ہمیشہ.. پتھر کا ایک پرندہ اڑان میں رہے گا..

حلاّج کے بُھس کی مانند مسخ چہرے پر ایک مسکراہٹ کے آثار تھے، گویا مسکراہٹ کی اُسی کے خون میں ڈوبی تتلیاں اُس کے ہونٹوں پر پھڑ پھڑاتی تھیں اور وہ بھی سنگسار کر دی جاتی تھیں..

اُس کل کے بعد پرسوں کا سورج فرات کے پانیوں میں سے اُبھرا تو.. اُس کے گلیوں میں گھسیٹے جانے سے خون آلود، خراش آلود ہاتھ اور پاؤں دمشق کے لوہے سے ساختہ تیز دھار تلوار سے کاٹ دیئے گئے.. حلاّج کے بریدہ ہاتھ اور پاؤں کیا ہوئے، کیا وہ کچھ دیر کے لیے ایک مرتے ہوئے پرندے کی طرح تڑپے.. کب تک اُن میں جان باقی رہی اور کب وہ ٹھنڈے ہو گئے اور کوئی نہ کوئی تو تھا ایسا حلاّج پر نثار ہونے والا جو اُنہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر لے گیا.. وہ کون تھا اور

اُس نے انہیں کہاں دفن کیا، تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں..

اقبال

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند	کم نگاہوں نے فتنے اٹھا دیے
بندۂ حق را بدار آویختند	بندۂ حق کو دار پر چڑھا دیا
آشکارا بر تو پنہاں وجود	تجھ پر وجود کا راز آشکار تھا
باز گو آخر گناہِ تو چہ بود	پھر بتا کہ تیرا گناہ کیا تھا

حلّاج

بود اندر سینہ من بانگ صور	میرے سینے میں بانگ صور تھی
ملتے دیدم کہ دارد قصدِ گور	اک ملت دیکھی جو خودکشی پر آمادہ تھی
من بخود افروختم نارِ حیات	میں نے خود پر زندگی کی آگ کو روشن کیا
مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات	مردہ کو زندگی کے اسرار بتائے
من ز نار و نورِ او دادم خبر	میں نے اس کو اسی کے نور و نار کی خبر دی
بندۂ محرم! گناہِ من نگر	اے بندۂ محرم، میرا گناہ دیکھ

اقبال

چیست دیدارِ خدائے نہ سپہر	نو آسمانوں کے خدا کا دیدار کیا ہے
آں کہ بے حکمش نہ گردد ماہ و مہر	جس کے حکم کے بغیر ماہ و مہر بھی گردش نہیں کرتے

حلّاج

نقش اول بجاں انداختن	پہلے اس کے نقش کو اپنی جاں پر لا رکھنا
باز او را در جہاں انداختن	پھر اسے جہاں پر بکھیر دینا

اُس کی آنکھیں بھی پھوڑ دی گئیں..

فقیہانِ حرم جب ظلم پر آمادہ ہوتے ہیں اور اکثر ہوتے ہیں تو اُن کی بربریت بھی بے مثال ہوتی ہے کہ وہ آسمانی کتابوں میں سے اُس کا جواز تلاش کرتے ہیں اور یوں ظلم کو ثواب کے پلڑوں میں تول کر سرخرو ہوتے ہیں.. حلّاج کی آنکھیں بھی پھوڑ دی گئیں..اور تب اُس کی آنکھوں کے خلاء کے اندھیاروں میں عشق اور جذب کے ان گنت دیئے جل اٹھے اور وہ بجھتے ہی نہ تھے اور ان آنکھوں میں سے جو لہو بہتا تھا وہ ان دِیوں میں تیل کی مانند جلتا تھا.. حلّاج کی آنکھوں کی کشتیاں جب نوکِ خنجر سے اکھاڑ پھینکی گئیں تو وہ فرات کے پانیوں پر رواں ہو گئیں..اُنہیں ڈبویا نہ جا سکا..ان جذب اور عشق کی کشتیوں کے بادبان ایک بار کُھل گئے تو پھر کبھی سمیٹے نہ جا سکے..وہ دریائے فرات سے رواں ہوئیں، زمانوں کی قید سے ماورا ہوئیں اور سندھ اور چناب میں اتر گئیں.. حلّاج کی آنکھوں کے پھوڑے جانے والے گھونسلے میں سے لہو کی جتنی بُوندیں گریں، اُن میں سے ہر بوند میں سے ایک گُل رنگ پرندے نے جنم لیا جو "انا الحق" کی پکار کرتا تھا..انہی میں سے ایک پرندہ سات پرندوں کے ہمراہ ایک نئے سچ کی تلاش میں اڑان کرتا جاتا تھا..

اُس کے لوتھ کو سُولی پر نصب کر دیا گیا..

عشق کی نماز ادا کرنے کے لیے اُس نے اپنے لہو سے وضو کیا..

روایت ہے کہ حلّاج کا چہرہ موت کی آمد سے زرد پڑتا جاتا تھا اور اُس نے اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کو خون آلود ٹُنڈ کو اپنے چہرے پر پوچ کر لال گلال کر لیا تا کہ صفِ دشمناں کو خبر نہ ہو..

کل کے بعد پرسوں اور پھر اترسوں کا سورج طلوع ہوا..

اُس کے لوتھڑے کا سر بھی کاٹ دیا گیا..اور یوں وہ کائنات جو ابھی ناتمام تھی، انا الحق کی

گونج سے مکمل ہو گئی..

اُس کے مصلوب شدہ بدن کو سپردِ آتش کر دیا گیا..جلایا گیا اور پھر اُس کی راکھ کو فرات کے پانیوں پر بکھیر دیا گیا جہاں حلّاج کی آنکھوں کی کشتیاں منتظر تھیں..جیسے سدھارتھ کی راکھ کو سینکڑوں کوزوں میں بند کر کے، ہاتھیوں کے ذریعے پوری سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچایا گیا اور وہاں اُس راکھ کے ہر کوزے کو دفن کر کے اُس پر سنہری سٹوپے تعمیر کیے گئے ایسے حلّاج کی آنکھوں کی بادبانی کشتیاں اُس کی راکھ کو سنبھال کر دنیا بھر کے اُن خطّوں میں لے گئیں جہاں جہاں عطار، مولانا رُوم، سچل سرمست، بھٹائی، بلھے شاہ اور مست توکلی قیام کرتے تھے، اُس کی راکھ کے گرد بُدھ کی راکھ کی مانند شاندار سٹوپے تعمیر نہ ہوئے بلکہ عشق کی سرمستی اور باغی قلندری کی شاعری کے جہان وجود میں آتے چلے گئے..

یہ عشق کی معراج کا تیسرا دن تھا..

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا..جنید سے پوچھا گیا کہ وہ تو کیفر کردار کو پہنچ چکا، اب فرمائیں کہ اب تو اُس کی راکھ بھی اڑا دی گئی کہ کیا وہ جھوٹ کہتا تھا؟

جُنید خاموش رہے تو پوچھا گیا کہ تو کیا وہ سچ کہتا تھا؟

تو جُنید نے اقرار کیا کہ ہاں..وہ سچ کہتا تھا پر یُوں برسرِ عام اُسے اعلان نہیں کرنا چاہیے تھا..

جنید ایسے جیّد کراماتی صوفی کی اس دلیل کے بارے میں تاریخ نے اپنا الگ فیصلہ محفوظ رکھا..ان دونوں میں فرق اتنا تھا کہ پرندہ دونوں کے قلب میں ایک ہی قیام پذیر تھا..جُنید نے اُسے شریعت کے جبر میں قید رکھا اور حلّاج نے اُسے آزاد کر دیا..

علم ترساں از جلالِ کائنات عشق غرق اندر جمالِ کائنات علم جلال کائنات سے خوفزدہ ہے عشق جمال کائنات میں غرق ہے

حلاج کی مصلوبیت کے زمانوں میں ہی شاید اس بحث نے جنم لیا.. اور اگر ایسا نہیں ہوا تو چلیے ہم خود آج کے تناظر میں پوچھ تو سکتے ہیں کہ اگر ابن مریم کو صلیب پر چڑھایا گیا تو اُنہوں نے فریاد کی کہ اے میرے رب تُو نے مجھے کیوں فراموش کر دیا جب کہ حلاج نے عشق کی معراج کے تینوں دنوں میں جتنے بھی خون آشام امتحان اُس پر اُترے، اُس نے کچھ شکایت نہ کی، فریاد کا ایک لفظ اپنے ہونٹوں پر نہ لایا کہ وہ شکایت کرتا تو بھی کس سے کرتا، اپنے آپ سے، اُس کے نزدیک حق اُس سے الگ تو نہ تھا، وہ خود تھا.. تو وہ کیسے خود سے ہی فریاد کرتا.. اُس کی ذات نے ہی اپنے آپ کو فراموش کر دیا تو وہ خود سے ہی شکایت کیسے کر سکتا تھا.. جس نے شکایت کی وہ تو ایک جہان کا مظلوم محبوب ہوا، اُس کی صلیب کے آگے ایک دنیا ابھی تک سرنگوں ہوتی ہے اور جس نے شکایت نہ کی اُس کے جذب اور عشق کی معراج کی قدر کیوں نہ ہوئی، حلاج کے پیروکار کیوں نہ ہوئے، وہ برگزیدگی کی لوح پر کیوں رقم نہ ہوا..

پُورن کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ ڈالے گئے، اُسے صلیب پر نہ چڑھایا گیا، ایک کنویں میں گرادیا گیا..

اور پُورن اُس کنویں کی پاتال میں تھا جب اُس کے بریدہ اعضاء میں سے جو لہو پُھوٹتا تھا اُس کی کسی ایک بُوند میں سے ایک پرندے نے جنم لیا، اُس کی اندھیاری کائنات کی کی تنہائی میں اُس کا ساتھی ہو گیا، اُسے تب تک گیت سناتا رہا جب تک کہ گورکھ ناتھ نے وہاں سے گزرتے ہوئے اُس کنویں میں جھانک نہ لیا...

برس ہزاروں بیت گئے، تب گورکھ ناتھ نے اس کنویں کے اندر نگاہ کی تھی اور اب مُوسٹے حسین اس کی منڈیر سے اس کی گہرائی میں اپنی آنکھیں اتارتا تھا، تب شاید کنویں کے پانیوں کی سطح اس کی منڈیر کے ساحل تک آتی تھی اور اب وہ اس کی گہرائی میں دفن ہوتی آسمان کا تارہ ہوئی جاتی

تھی..اور وہاں سرخ بھربھری اینٹوں کی گولائی کی آغوش میں جو پانی تھے، اُن کی سطح پر گلاب کی پتیاں مُردہ بیر بہوٹیوں کی مانند تیرتی تھیں..

مُوئے حسین دیر تک اُن مردہ بیر بہوٹیوں کو تکتا رہا اور پھر اُسے واہمہ ہوا کہ گلاب کی پتیوں میں سے اُنہی کے سُرخ رنگ کا ایک پکھیرو پانیوں پر ابھرا، بلند ہوا، مُوئے حسین کو جھانکتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر اُس کے کان میں سرگوشی کی.. تیرے نصیب میں اولاد نہیں ہے، وجدان اور وارفتگی ہے، اُسے تلاش کر..ٹلہ جوگیاں، ٹلہ جوگیاں، کُوکتا وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اُس کے سر پر سے گزر کر کسی نئے سچ کی جستجو میں اُڑان کر گیا..

■•◆•◆•◆•◆•■

اُس نے احتیاط تو بہت کی، دم رو کے ایک ڈری ہوئی بلّی کی مانند دبے پاؤں بستر تک گیا، صفورا اوندھی پڑی بے سُدھ سو رہی تھی اور اُس لمحے اُسے احساس ہوا کہ ایک جدید زمانے کی سب سے بڑی لعنت ڈبل بیڈ ہے.. جب الگ الگ چار پائیاں ہوا کرتی تھیں تو انسان بے خطر اُن کی سنگل پرائیویسی میں نہ صرف محفوظ رہتا تھا بلکہ اطمینان سے نیند کرتا تھا اور صرف بہ وقت ضرورت اپنے بدن کی پیاس بجھانے کی خاطر برابر کی چارپائی سے رجوع کر لیتا تھا.. یہ پرائیویسی ماڈرن لِونگ نے چھین کر اُس کی جگہ ایک ڈبل بیڈ بچھا دیا. شادی کے ابتدائی ایام میں تو اس کی افادیت اور کارکردگی ایک نعمت ہوا کرتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ڈبل بیڈ ایک اذیت ہوتا گیا.. جب کسی جانب سے بھی بدن کا کوئی جرثومہ وصال کے لیے نہ کلبلائے تو ڈبل بیڈ پر سونا ایک شرمندگی اور ناآسودگی ہوتا جاتا تھا.. انسان اپنی پرائیویسی کی آرزو کرتا ہے کہ جب وہ ایک سنگل بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر استراحت کرتا تھا اور اُس کی ٹانگیں.. دیگر زوال پذیر ڈھلکی ہوئی ٹانگوں سے مَس نہ ہوتی تھیں.. اور نہ ہی جیون ساتھی کے خراٹوں کی آوازرات بھر اُس کے کانوں کے قریب سانس لیتی تھی..

مُوسے حسین نے احتیاط تو بہت کی لیکن ڈبل بیڈ پر سرکتے ہوئے جب اُس نے لیٹنے کی کوشش کی تو اتنی سی آہٹ سے صفورا جاگ گئی..

''ہو آئے؟''

''ہاں..''

''تو وہاں کیا ہوا.. کیا وہاں پُورن کے مندر کے فرش پر نقش یُونی، مجھ سے مختلف تھی..''

''صبح بات کروں گا..''

''کیا تم نے تصور کیا کہ میں کنویں کے پانیوں سے نہا دھو کر شلوار نیچی کر کے یُونی کے اُس نقش پر بیٹھی ہوئی تھی..''

''صفورا پلیز.. میں بہت تھکا ہوا ہوں..''

''تم نے اُس یُونی سے کیا مَس کیا اولاد کے حصول کے لیے.. تو اوہام پرست بے وقوف.. ایک مرتبہ اور کوشش کرنا چاہتے ہو تو میں اپنے آپ کو پھیلا سکتی ہوں..''

بیڈ رُوم کی نیم تاریکی میں صفورا کی دبی دبی ہنسی میں ایک تمسخر کی آمیزش تھی جو اُسے رات بھر سنائی دیتی رہی..

■◆◆◆◆◆◆◆■

اُسے کہاں خبر تھی کہ یہ ٹلہ جوگیاں نام کی پہاڑی کس کائنات میں ہے اور اگر پاکستان میں ہے تو کہاں ہے، اُس نے بہت کھوج کی، اُس خطّے کے بارے میں تحریر شدہ سفرنامے اور قدیم قصّے پڑھے..اُسے بتایا گیا کہ یہ ٹیلا شہر جہلم کے نواح میں، روہتاس کی فصیلوں کے دامن میں سے اٹھتا تھا اور وہ نہایت آسانی سے دو تین گھنٹوں کی قدرے کٹھن چڑھائی کے بعد اس کی چوٹی پر پھیلے کھنڈروں تک پہنچ سکتا ہے.. پُورن کے کنویں میں سے برآمد ہونے والا پرندہ اگر اُس کا راہنما ہو جاتا تو شاید وہ اتنا دربدر نہ ہوتا..

دن دسمبر کے تھے..

ابھی بہت سویر تھی..خاردار گھنی جھاڑیوں میں اُلجھا ہوا پتھریلا راستہ دسمبر کی دُھند کے سفید کفن میں لپٹا ہوا تھا..اور یہ دُھند جھاڑیوں میں تیرتی پھرتی تھی گویا بائبل کے پہلے باب کے منظر ظہور میں آ رہے تھے..

جھاڑیوں کے نوکدار پتوں کی ہر نوک پر شبنم کا ایک ایک قطرہ ابھی تک معلّق اور موجود ٹھہرا ہوا تھا..اُن قطروں پر طلوع کے سُرخ تیر اترے تو اُن کے چہرے حلاّج کی مانند لہورنگ ہو گئے..جیسے پتوں کی نوکیں بھی اُس کے لہو میں ڈوب کر ابھریں..

مُوسےٰ حسین کا رخشِ عمر لڑکھڑاتا ان جھاڑیوں سے کھیتا تو شبنم کے وہ قطرے لرزش سے دوچار گرتے اور اُس کے جوگرز پر خون کی بُوندوں کی مانند ٹپکتے..

بے شک یہ پُورن کے کنویں پانیوں کی سطح پر تیرتی سرخ بیر بہوٹی گلاب کی پتیوں میں سے ظاہر ہونے والا وہ لال لال پنچھی تھا جس نے ٹلہ جوگیاں، ٹلہ جوگیاں کی سرگوشی کی تھی، ادھر آنے کا مشورہ دیا تھا لیکن یہ تو کوئی جواز نہ تھا یوں اس عمر میں یوں در بہ در بلکہ پتھر بہ پتھر ہونے کا.. اپنے آپ کو ہلکان کرنے کا جب کہ کچھ طے نہیں کہ اگر بہ فرضِ محال وہ بلندی تک پہنچ بھی گیا تو کیا وہاں کوئی جواب اُس کا منتظر ہوگا بھی کہ نہیں..

بے شک کوئی جواز نہ ہو، کیا یہ اشد ضروری ہے کہ ہر مسافت کا کوئی نہ کوئی جواز ہو..کوئی مدلل مقدمہ درپیش ہو کہ ذرا ثابت کیجیے کہ یہ مُوئے حسین ایک نقاہت سے لرزاں بدن کو تقریباً گھسیٹتا جس کی آنکھوں میں صرف دم ہے آخر کیوں ایک اجنبی پہاڑی کی اجنبی چوٹی پر پہنچنے کی جستجو کر رہا ہے..

جواز ہمیشہ گھڑے جاتے ہیں اور دلائل تخلیق کر لیے جاتے ہیں..

یہ کیا کہ ہر مسافت کا جواز ہونا چاہیے، دلیل ہونی چاہیے..عقیدے کے جواز بھی تو گھڑے جاتے ہیں، موافق دلائل تخلیق کیے جاتے ہیں تو پھر کیا ضروری ہے کہ اس ہاتھی کی شکل کے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بھی جواز اور دلائل درکار ہوں..

نوکدار پتوں پر لرزتے اوس کے قطرے، کرنوں کی تمازت کی تاب نہ لا کر تحلیل ہو رہے تھے اور یوں جھاڑیوں کے بھیتر میں ایک دُھند تیرتی دِکھتی تھی..

مثالِ قطرۂ شبنم بہ نوکِ گیاہ
رہے رہے نہ رہے، نہ رہے..

ایک ایسا چہرہ جو موسموں کی شدت سے محفوظ، ایئر کنڈیشنڈ گھروں اور دفتروں کی ٹھنڈک

اور حدت میں حنوط نہ ہوا تھا، کھلی فضاؤں کا پروردہ اور گرمی سردی سہنے والا ایک چہرہ اُس سبک رفتار لڑکی کا تھا جو اس کی موجودگی سے لاتعلق جوگنگ کرتی چلی آتی تھی اور اس کی پونی ٹیل ایک گلہری کی مانند اُس کی گردن پر اُچھلتی کُودتی چلی جاتی تھی..

اُس کی نیم کُھردری شکل میں پہچان کی پرچھائیاں تیرتی تھیں..وہ دیکھی ہوئی لگتی تھی.. پر کہاں دیکھی تھی.. یادداشت کے بُوٹے عمر کے ٹوکے کی دھار تلے کٹ کٹ کر چارے کی شکل اختیار کر رہے تھے پر یہ شکل پہچان میں نہ آ رہی تھی..

مُوسئے حسین نے اپنی کوہستانی مسافت کی تنہائی میں در آنے والی اس پونی ٹیل کی مداخلت کو پسند نہ کیا ''تم کون ہو؟''

اُس کی موسموں کو سہہ جانے والی کُھردری شکل نے نہیں، اُس کی پونی ٹیل نے ایک سنپولیے کی مانند لہرا کر کہا ''میں زندگی ہوں..زندگی سے ڈرتے ہو؟''

■•◆•◆•◆•■

شہر لاہور کے کسی زمانے کے بہت پاش اور چمکتے دمکتے ڈیفنس کے رہائشی علاقے کے عین وسط میں واقع پرائیویٹ نیشنل ہوسپٹل کے کمرہ نمبر 24 کی کھڑکی جو کہ دوسری منزل پر معلّق تھی اور وہ کھڑکی اس ہسپتال کے پہلو میں پھیلی ہوئی ایک وسیع قدرے اجاڑ فٹ بال گراؤنڈ پر کھلتی تھی، کھلتی تو خیر نہ تھی کہ اس کا دبیز شیشہ اس کے فریم میں جڑا ہوا ایک حنوط شدہ دیوار تھا.. اگر ہسپتال کے سب کمروں کی سب کھڑکیاں یوں شیشے کی دیواریں تھیں، کھلتی نہ تھیں تو اس میں بھی ایک مصلحت پنہاں تھی، کھڑکیاں کھلی ہوتیں تو اپنی لاعلاج بیماری سے عاجز آ چکے، کسی کینسر کا شکار، دماغی عارضے میں مبتلا متعدد آپریشنوں کے باوجود صحت مند نہ ہو سکنے والے اگرچہ اُن کے معالج اُنہیں ڈھارس دیتے تھے کہ آپ چند روز میں شفایاب ہو کر اپنے قدموں پر چلتے اپنے گھر چلے جائیں گے، ایسے لاچار مریض اگر کھڑکیاں کھلی ہوتیں تو وہ موت کی اذیت کے منتظر ہونے کی بجائے ان کھڑکیوں سے کود کر خودکشی کر لیتے..

مُوئے حسین کا مرض اگرچہ لاعلاج نہ تھا لیکن ہر شب وہ بیماری کی نقاہت سے عاجز یہ خواہش کرتا کہ کاش یہ کھڑکی کھلی ہوتی..

اُس شیشہ دیوار مقفل کھڑکی میں سے ایک منظر دکھائی دیتا تھا.. باہر کے موسموں کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی، وہ کھڑکی سے دکھائی دینے والے شیشم کے ایک شجر کو تکتا رہتا، اگر تو اُس کے پتے ایک ساکت تصویر ہوتے جیسے اُس کی کسی لینڈ سکیپ میں نقش ہوں تو باہر حبس اور سکوت کے دن ہیں اور

اگر اُس شیشم کے پتّے ایک مجذوب بچے کی مانند تالیاں بجا رہے ہوتے، ہوا کے زور سے یوں پھڑ پھڑاتے جیسے وہ پرندے ہوں اور ذبح کیے جا رہے ہوں تو اندازہ ہوتا تھا کہ ہاں، وہاں زندگی ہے..حرکت ہے اور نبض چل رہی ہے..

اور وہاں، اگرچہ وہ دیکھ تو نہ سکتا تھا وہاں لوگ اپنے روزمرہ کے کاموں اور مشغلوں میں گُم، کھیلتے کُودتے، پارکوں میں لڑکیوں کو ٹٹولتے، چوری چھپے چُومتے، بیویوں سے بیزار، فٹ پاتھوں پر چلتے، ہرگز آگاہ نہ تھے کہ وہ جو دوسری منزل پر ہسپتال کی ایک کھڑکی شیشے کی مقفل ہے اُس کے اندر درجنوں ٹیوبوں سے پرویا ہوا، جس کا پیٹ متعدد آپریشنوں کے نتیجے میں کشیدہ کاری کا ایک کچّا نمونہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ اُس کی حیات کی سب سے بڑی پہچان ناف، جو اُس کے شکم مادر سے کٹ جانے کی نشانی تھی، وہ بھی نشتر کی زد میں آ کر معدوم ہو چکی تھی، وہ فرصت کے اوقات میں اُس میں اُنگلی گھما کر کچھ میل برآمد نہیں کر سکتا تھا..ذرا زور سے سانس لینے سے اُس کے پیٹ پر کشیدہ کیے گئے ٹانکے ادھڑ سکتے تھے، ٹوٹ سکتے تھے..

ے لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہ شیشہ گری کا..

ملک کا ایک نامور مصوّر...

ہسپتال کے باہر پارکنگ احاطے میں تین ایسی ٹیلی ویژن چینلز جنہیں لوگ کم ہی دیکھتے تھے اُن کی نشریاتی گاڑیاں کب سے وہاں کھڑی تھیں، اتنی بیکار کہ شاید وہ کبھی کبھار ایک آدھ جمائی بھی لے لیتی تھیں اور اُن کے اندر بیزار ہو چکے تکنیک کار اور مائک کو ایک شولنگ کی مانند تھامے کچی عمروں کے بے وقوف سے میزبان اُس کی موت کے منتظر تھے کہ کب وہ ایک نرس جو اُس کی دیکھ بھال پر متعین تھی اور جسے انہوں نے ایک معقول معاوضے سے آمادہ کر لیا تھا، بھاگتی ہوئی ہسپتال

کے صدر دروازے سے برآمد ہوا اور اُنہیں خبر کردے کہ وہ.. مر گیا ہے.. اور وہ فوری طور پر یہ بریکنگ نیوز نشر کر کے دیگر چینلوں پر سبقت حاصل کر لیں پر وہ مرتا ہی نہ تھا.. ملک کا نامور مصور مُوئے حسین بہت ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا.. ٹیلی ویژن چینلز کی یہ نشریاتی گاڑیاں دراصل ایسے گِدھ تھیں جو موت کی بُو سونگھ کر مرنے والے کی حیات کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اڑتی ہوئی موت کے منتظر تک پہنچ جاتی تھیں..

درجنوں ٹانکے ادھڑتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اس لیے وہ سانس بھی آہستہ لیتا تھا.. شیشہ گری کا کام بہت نازک تھا..

وہ چنگا بھلا تھا.. روٹین کے مطابق ہر سویر اپنی کھٹارا فوکس ویگن میں مصوری کے سب سامان لاد کر شہر سے نکل کر ابھی تک عارضی طور پر محفوظ کھیتوں اور ندی نالوں کی جانب چلا جاتا.. کیکر کے درختوں، جوہڑوں، سرکنڈوں، ہری کچور فصلوں اور اینٹوں کے متروک شدہ بھٹوں کے ٹیلوں کو نہایت دل سوزی سے ایک ایک سٹروک سے اپنے کینوس پر اتارتا اور تب ایک سویر اُس نے اپنے تئیں کینوس پر سبز پینٹ سے لتھڑا ہوا برش لگایا تو وہ سبز دکھائی نہ دیا، سیاہ ہو گیا.. شاید یہ ضعفِ بصارت کا سیاہ پن تھا.. لاہور کی سویر سیاہی میں گھلی ہوئی دکھائی دینے لگی.. گھر لوٹ کر اُس نے ایک بیکار کینوس پر مختلف رنگ لگائے اور سب کے سب ایک شب دیجور کی مانند سیاہ دکھائی دے رہے تھے..

اُس نے اپنے ایک مداح اور دوست ڈاکٹر سے رجوع کیا اور وہ دھر لیا گیا.. ”حضور، الٹرا ساؤنڈ اور ایم آر آئی کے ٹیسٹوں کی رپورٹس،.. آپ کا پورا جگر کسی نامعلوم سیاہ جھلّی سے ڈھانپا گیا ہے اور یہ جھلّی پھول رہی ہے.. کسی بھی لمحے پھٹ سکتی ہے.. معمولی سا آپریشن ہے..“

جان لیجئے کہ کوئی بھی آپریشن معمولی نہیں ہوتا، انسانی بدن میں رواں حیات کو جب مدہوش اور بے خبر کر کے نشتر لگائے جاتے ہیں، چیر پھاڑ کی جاتی ہے تو اُس کے اندر آنتوں، رگوں اور نالیوں کی جو بھول بھلیاں آپس میں الجھی ہوتی ہیں اُن سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور انہیں سلجھانا بہت مشکل ہوتا ہے.. آفاق کی شیشہ گری کی نزاکت کے معاملے ہوتے ہیں جنہیں نشتر کی ایک چُوک کرچی کرچی کر سکتی ہے.. گویا جولو ہے کا تانا بانا ہوتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کونسے ٹوٹے ہوئے دھاگے کی گانٹھ کہاں لگانی ہے.. کونسا دھاگا بوسیدہ ہو کر نظام بدن میں رکاوٹ ہو رہا ہے.. چنانچہ کوئی بھی آپریشن معمولی نہیں ہوتا.. نصیب اچھے ہوں تو معمولی ہوتا ہے ورنہ کوئی ایک دھاگا جس کے ساتھ حیات کے پرندے کے پَر بندھے ہوتے ہیں، ٹوٹ کر اُسے آزاد بھی کر سکتا ہے..

مُوئے حسین دھر لیا گیا تھا..

■•◆•◆•◆•■

آئی سی یُو..

انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں جہاں اُس نے پہلے پانچ گھنٹوں کے طویل آپریشن کے بعد اور پھر ایک اور جان لیوا چیر پھاڑ کے بعد اِک عالم مدہوشی میں آنکھ کھولی تو وہ دودھیا روشنی میں دُھندلاتی ایک محفوظ اور مقفل کائنات تھی، وارڈ میں حرکت کرتی نرسیں اور زیرِ تربیت ڈاکٹر اور بستروں پر پڑے مریض سب کے سب ایک دھند میں ملفوف کبھی ظاہر ہوتے اور کبھی روپوش ہوتے نظر آتے تھے..ایئر کنڈیشنرز کی ایک مسلسل اور دماغ میں بھنبھناتی مدھم مشینی آواز کانوں میں اترتی اسے اپنے زندہ ہونے کی سرگوشیاں کرتی تھی..اس کے سوا مریضوں کی آہیں، پکاریں اور دعائیں تھیں جو موت کی ایک سمفنی کی مانند کبھی مدھم اور کبھی بلند آہنگ ہو جاتی تھیں.. یہ باہر کی دنیا سے منقطع ایک ایسی سیکولر کائنات تھی جہاں نہ دن ہوتا تھا اور نہ رات اترتی تھی، ایک ملگجی دودھیا روشنی کا لامتناعی تسلسل تھا..اُس کے حلق میں پیاس کے صحراؤں کے سب تھوہر اور کانٹے فصل در فصل اُگتے چلے جاتے تھے لیکن فریاد کے باوجود اُسے ایک بوند پانی کی نہ ملی کہ نرس کے مطابق پانی کی صرف ایک بُوند اُس کے بدن میں اتر کر اُس کے زخموں کو ادھیڑ سکتی تھی..اُسے اگلے چوبیس گھنٹے پیاسا رہنا تھا..وہ اپنی مدہوشی سے مکمل طور پر باہر نہ آ رہا تھا..از حد اذیت اور سانس کی دشواری کے باوجود اُس کے اندر جو حِس مشاہدہ ایک مصور کی تھی، وہ مدہوش نہ ہوئی تھی..

اُس کے لیے یہ انتہائی نگہداشت کا ایک وارڈ نہ تھا قربت مرگ میں مبتلا ایک لینڈ سکیپ تھی..

وارڈ کے داخلے کے قریب بائیں جانب پہلے بستر پر گھنگھریالے بالوں والا، سوہنی شکل والا جس کے نین نقش زردی میں اترتے جاتے تھے ایک تین چار سال کا بچہ جانے کس نیند میں پڑا تھا.. اُس کے مختصر بدن میں نالیوں اور ٹیوبوں کی ایک آرائش پیوستہ تھی.. بستر کے سرہانے ایک سٹول پر براجمان اُس کی ماں کے ہونٹ ہلتے تھے، وہ کچھ پڑھتی جاتی تھی اور اُس کے مُردہ ہوتے چہرے پر پھونکتی جاتی تھی.. وہ اُس کی صحت کی دعا کرتی تھی یا تمنا کرتی تھی کہ اُس کی ننھی سی جان آسانی سے چلی جائے.. روزانہ ایک سیاہ پگڑی میں ملبوس بے اعتنا سا شخص، ایک سیاہ چوغے میں ڈھکا ہوا آتا اور اُس بے خبر بچے کے کانوں کے قریب اپنا منہ لے جا کر کچھ پڑھتا.. اور پھر کبھی کبھار قدرے بلند آواز میں علی مدد کی صدا بلند کرتا..

اُس بچے کے برابر میں ایک مریض نہ تھا.. ایک غیر واضح شکل کا ڈھانچا پڑا تھا جس کے بارے میں یہ طے کرنا دشوار تھا کہ وہ کوئی مرد یا عورت.... زندہ بھی ہے یا نہیں.. اُس کا چہرہ نیم سیاہ ہو چکا تھا اور جبڑا کھُلا ہوا تھا، وہ ایک حنوط شدہ ممی کی مانند دکھائی دیتا تھا یا دیتی تھی جیسے ابھی ابھی اُسے سنکیانگ یا مصر کے صحراؤں میں سے برآمد کیا گیا ہو اور وہ خوش شکل عورت... اُس سیاہ پڑتے ڈھانچے کی نواسی یا پوتی ہو سکتی تھی، جب اسی ممی کے اب سکڑ چکے مردہ ہونٹوں نے اُس کی پیدائش پر اُس کے کانوں میں مسرت کی ایک سرگوشی کی تھی، ہوش سنبھالنے پر اُس نے پہلا کلام نانی یا دادی کیا تھا.. بلکہ طے نہ ہو سکتا تھا، کھلے منہ کا سیاہ جبڑا ایک دادا یا نانا بھی ہو سکتا تھا اور آج وہ اپنے زندہ پھڑ پھڑاتے ہونٹ اُس کے کانوں سے جوڑ کر مسلسل سورۃ یاسین ایک مدھم سرگوشی کی صورت پڑھتی جاتی تھی.. وہ ڈھانچہ کہیں نہ کہیں زندہ تھا پر اُس کا ادراک دیکھنے والے کے لیے ناممکن تھا.. اُس خوش شکل عورت کے چہرے پر اگرچہ ملال کے سیاہ بسیرے تھے، حزن ایک سیاہ تتلی کی مانند پھڑ پھڑاتا تھا لیکن وہ بیزار دکھائی نہ دیتی تھی، کیا معلوم وہ اُس ڈھانچے کے اندر ابھی تک قید زندگی کے آخری

سانسوں کے چھٹکارے کے لیے، سورۃ یاسین کا ورد مسلسل کرنے کے دوران پروردگار سے التجائیں بھی کرتی ہو.. اس کے یہ امتحان ختم کردے، اس نے زندگی بھر مجھ سے محبت کی ہے، اس کی جان کسی اور جہان کے کانٹوں میں گھسیٹی جا رہی ہے، اسے آزاد کردے.. آئی لو یو دادی.. دادا.. پلیز مرجاؤ!

وارڈ کے آخری کونے میں کفن ایسے سفید بستر میں کوئی شخص جس کا چہرہ آکسیجن ماسک سے ڈھکا ہوا تھا گہری بے خبر مدہوشی میں پڑا تھا.. اگرچہ وہ کئی روز سے ایک کوے میں جا چکا تھا، بے حس وحرکت پڑا تھا لیکن کبھی کبھار اُس کا ایک ہاتھ اٹھتا اور گلے میں آویزاں چاندی کی ایک صلیب کو ٹٹولنے لگتا..

موسےٰ حسین اگرچہ متعدد ٹیوبوں اور نالیوں میں پرویا ہوا، آکسیجن ماسک کے اندر گہرے سانس لیتا انتہائی نگہداشت وارڈ میں سب سے زندہ مریض تھا، اُس کے مشاہدے کی حس درد کو بے حس کردینے والی دوائیوں کے زیراثر عام زندگی سے بھی بڑھ کر تیز ہوگئی تھی، اس مرگ لینڈ سکیپ کے سب سیاہ رنگوں کی پہچان کرتا انہیں یادداشت کے کینوس پر اُتار رہا تھا.. وہ مسلسل ایک نیم غنودگی کے عالم میں دن رات کی موجودگی یا ناموجودگی سے غافل پڑا رہتا البتہ وہ سٹاف کی تبدیلی سے جان جاتا کہ باہر کی دنیا میں یہ طلوع یا غروب کے لمحے ہیں.. اُس کی نیم مدہوش حسیات کبھی کبھار تب مکمل طور پر بیدار ہو جاتیں جب اُس کے کانوں میں کچھ دبی دبی سی سسکیاں آتیں اور وارڈ میں سے باہر دھکیلے جانے والے سٹریچر کے پہیوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی.. شاید گھنگھریالے بالوں والا وہ بچہ.. یا پھر وہ ممی ڈھانچہ آزاد ہو گئے تھے.. اپنے قفس سے بالآخر پرواز کر گئے تھے.. آخری علی مدد کہا جا چکا تھا اور آخری آئی لو یو دادی سورۃ یاسین کی آمیزش سے پڑھا جا چکا تھا.. چہرے پر اور کانوں میں پھونکے جانے والے سب مقدس طلسم گھنگھریالے بالوں والے بچے پر بیکار گئے تھے، سیاہ کھلے منہ والے ڈھانچے پر کام کر گئے تھے...

اُس کی ایک ہسپتال اٹینڈنٹ کے ہاتھوں سے دھکیلی جانے والی وہیل چیئر کے پہیے بھی برآمدوں میں چرخ چوں کرتے چلے جا رہے تھے اور اُن میں سے برآمد ہوتی آوازیں سٹریچر کے بوسیدہ پہیوں میں سے نکلنے والی فریادوں سے قدرے مختلف نوعیت کی تھیں.. سٹریچر کو مُردہ ہو چکے ایک بدن کے احترام میں قدرے احتیاط سے دھکیلا جاتا تھا جب کہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے فارغ کیے جانے والے مریض کی وہیل چیئر نہایت بے دردی سے دھکیلی جاتی تھی.. آج سویر اگرچہ وارڈ میں وہی دودھیا رنگت کا حنوط ہو چکا زمانہ ٹھہرا ہوا تھا، اُس کے معالج نے اُسے پرائیویٹ کمرے میں شفٹ کر دینے کا فیصلہ کیا تھا..

وارڈ سے باہر آتے ہی اُس پر زندگی کے شور کی یلغار ہو گئی.. ابھی وہ سکوت کے ایک ڈربے میں بند تھا اور ابھی جب اُس کی وہیل چیئر وارڈ سے باہر آئی تو وہاں برآمدوں میں چلتے پھرتے لوگ تھے، ڈاکٹر اور نرسیں زندہ حالت میں دکھائی دیتے تھے کہ وارڈ کے اندر وہ خودکار پُتلیوں کی مانند چلتے پھرتے تھے.. وہیل چیئر ایک ایسی راہداری میں مُڑی جس کے عین سامنے ہسپتال کی ایک بلند شفاف شیشے کی کھڑکی تھی.. اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں.. وہاں روشنی تھی، دھوپ کی شدت پگھل کر سفید ہوتی تھی.. شیشے کی کھڑکی میں سورج طلوع ہوتا جا رہا تھا اور جب اُس کا چہرہ اُس کی کرنوں کی زد میں آ کر ایک قدیم گندھارا گہنے کی مانند دمک اٹھا تو جیسے ایک نہیں لاکھوں سورج اُس پر طلوع ہو گئے.. زندگی لوٹ آئی تھی.. وہ ایک فاتر العقل شخص کی مانند مسکرانے لگا.. قریب سے گزرتے لوگوں اور مریضوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر متوجہ کر کے مسکراتا گیا.. ہیلو.. السلام علیکم.. آپ کیسے ہیں.. گڈ مارننگ.. میں مُوئے حسین ہوں..

پرائیویٹ کمرہ نمبر 26 کی مقفل مستطیل شیشہ کھڑکی میں دوپہر ڈھلتے ہی یہی پونی ٹیل والی ایتھلیٹ لڑکی جو اُس کے پہلو میں سے ٹلّہ جوگیاں کی چڑھائی کے دوران جوگنگ کرتی اُسے، زندگی سے ڈرتے ہو.. کہہ کر گزر گئی تھی، وہ اس کھڑکی کے شیشے میں سے یوں ابھرتی جیسے کسی ایجئین سمندر میں سے ایک یونانی دیوی جنم لیتی ہے.. پل بھر کے لیے شیشے کی چوکھٹ میں تصویر ہوتی اور پھر گر جاتی..

ہسپتال سے متصل وسیع فٹ بال گراؤنڈ میں جونہی سورج ذرا ڈھلتا، بہت سے اتھلیٹ، لمبی دوڑوں کے کھلاڑی اور باکسر وغیرہ ورزش کے لیے آ جاتے.. اور ان میں کسی مقامی عورتوں کی فٹ بال ٹیم میں شامل لڑکیاں ٹریک سُوٹس میں ملبوس بال پونی ٹیل میں باندھے ہوئے، متحرک اور گٹھے ہوئے بدنوں والیاں شاید کسی جمپنگ پیڈ پر اپنے آپ کو چُست رکھنے کی خاطر اُچھلتی چلی جاتی تھیں.. ان میں صرف ایک لڑکی ایسی تھی جس کے بدن میں لچک ایسی تھی کہ وہ بقیہ کھلاڑیوں کی نسبت اُچھلتی تو وہ پیچھے رہ جاتیں اور وہ اُن سے الگ بلند ہو کر کمرہ نمبر 26 کی مستطیل شیشہ کھڑکی کے فریم میں آ جاتی، دکھائی دیتی اور یکدم گر جاتی...

یہ وہی لڑکی تھی..

"تم زندگی ہو؟"

پونی ٹیل لڑکی نے اُس کے پژمردہ رخساروں پر اپنے سلگتے ہونٹ ثبت کیے "زندگی سے ڈرتے ہو؟"

اور پھر زقندیں بھرتی اُس سے آگے نکل گئی..

■•◆•◆•◆•■

وہ ایک ڈرپوک حلاج تھا..

معاشرے سے ڈر جانے والا، مفاہمت کرنے والا، اُسے سُولی پر چڑھ جانے سے خوف آتا تھا اس لیے انا الحق کا اعلان نہ کرتا تھا.. اگرچہ وہ قادر تھا.. اُن لمحوں میں جب وہ کسی زمینی منظر کو اپنے کینوس پر منتقل کرتا، اُسے ہو بہو ویسے نہیں جیسے اُسے دکھائی دیتا تھا کینوس پر اتارتا.. اُس میں اپنی من مرضی شامل کر کے بڑے تخلیق کار کی تخلیق کردہ لینڈ سکیپ سے بغاوت کر دیتا.. دُھند کے ہر ذرے میں وہ اپنی ذات کا ایک پرندہ نقش کر دیتا، کیکر کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کے ہر کانٹے میں اپنی ناتمام حسرتوں کی دھجیاں اُلجھا دیتا.. جوہڑ کے پانیوں کو پینٹ کرتے ہوئے وہ اپنا بُرش ہمیشہ تخلیق کے پہلے لمحے میں پانیوں پر جو دُھند تیرتی تھیں اُن میں ڈبوتا.. اور یوں جب وہ لینڈ سکیپ مکمل ہو جاتی تو وہ کینوس سے دو قدم پیچھے ہو کر ایک خدائی تکبر سے تکتا.. اور اُس سویر کی سرد سرسراتی ہوا کے کانوں میں سرگوشی کرتا کہ اے ہوا میری تخلیق کردہ اس دنیا کے اندر جا کر پرکھو تو سہی کہ کون بڑا تخلیق کار ہے.. بادِ نسیم کی مانند ہولے سے چلو، کیکر کے درختوں سے ذرا دامن بچا کے کہ اُن کے کانٹوں میں میرے ارمانوں اور دعاؤں کی دھجیاں مصلوب ہو رہی ہیں اور میری تخلیق کردہ دُھند کے ہر سفید ذرّے میں جھانکو اُن میں تمہیں کون دکھائی دیتا ہے.. یہ آبی ذرّے آئینے جن کا آئینہ ساز میں ہوں، ان کے رو بہ رو ہو کر دیکھو تو سہی ان آئینوں میں کس کا عکس ہے.. اور کون ہے آئینوں میں، میں ہی میں ہوں.. میرے بُرش کے معجزے سے ہی مناظر کی یہ کائناتیں جنم لے رہی ہیں،

میرے کُن فیکون کہنے سے ہی یہ وجود میں آئی ہیں..

میں نے انہیں مُتشکل کیا..اے ہوا مُنصف ہو جا، فیصلہ تمہارے سپرد کرتا ہوں، کیا میرا مصور کردہ منظر اُس منظر پر فوقیت نہیں رکھتا جسے دیکھ کر میں نے اسے کینوس پر اتارا ہے، فیصلہ تمہاری سرد انگیز سرسراہٹوں کی روح میں پنہاں ہے کہ کیا میری نقل، اصل سے برتر نہیں ہے.. میں تو ایک ڈرپوک حلّاج ہوں، اعلان میں نہیں کرسکتا کہ انا الحق کہنے سے جان جاتی ہے..

ہر تخلیق کار، وہ مصنف ہو، مصور ہو، موسیقار ہو جب اپنے آپ کو تخلیق کی بھٹی میں پگھلاتا ہے تو گویا اُسے جس نے کُل کائنات کو نقش کیا اُسے ایک دعوت مبارزت دیتا ہے..اُس کی قدرت کو چیلنج کرتا ہے، اُس کی ہمسری کرنے اور اُس پر بازی لے جانے کے جنون میں اپنی ہی آتش میں بھسم ہو جاتا ہے..تاج محل کو تخلیق کرنے والے معمار یا نقاش نے بھی اس کی تکمیل کے بعد اک بے خودی کی بے خود کیفیت میں پکارا تو ہوگا کہ تُو نے ہمیں بنایا اور ہم نے تاج کو..تو ہم دونوں میں سے بڑا کون ہے..

''میرے پیٹ پر آپ کی کشیدہ کاری کے سب ٹانکے اور زخم بھر گئے ہیں، میری بیماری مایوس ہو کر پھر سے کسی اور لمحے ظاہر ہونے کے لیے پسپا ہو چکی ہے تو کیا میں اتنا صحت مند ہو چکا ہوں کہ پہاڑوں پر چڑھ سکوں؟''

''کتنے بُلند پہاڑ؟'' اُس کے مہربان معالج نے مسکرا کر پچھلے ہفتے پوچھا تھا..

''دراصل پہاڑ نہیں..بلکہ ایک معمولی سا ٹیلہ..''

''کیا اُس ٹیلے پر چڑھنا بہت ضروری ہے؟''

''جی سَر..وہاں گئے زمانوں کے کچھ لوگ اور پرندے میرے منتظر ہیں؟''

''پرندے؟''

دِن دسمبر کے تھے..

ابھی تک سویر کی دُھند کے ذرّے جھاڑیوں کے گھنے پن میں سفید جگنوؤں کی مانند اُلجھتے بھٹکتے تھے..

اُس لمحے، مُوسےٰ حسین نے اندازہ لگایا کہ وہ جان بوجھ کر اپنی کلائی کی گھڑی گھر چھوڑ آیا تھا تا کہ وہ وقت کے پیمانوں سے باگیں تڑوا کر ایک سکوت میں آئے ہوئے وقت کی قید سے آزاد خلاء میں سفر کر سکے..اس لمحے اُس کی بیوی صفورا شیر دل..اپنے سر میں ہمہ وقت گونجتی اذیت ناک صداؤں کو مدھم کرنے کے لیے سکون آور گولیاں پھانک چکی ہوگی، اپنے درد سے لبریز گھُٹنوں پر ایک مرہم کا لیپ کر چکی ہوگی..شاید وہ اس لمحے نیند میں مدہوش اُس ملازمہ کو پکارتی ہوگی جس کا تنومند باریش خاوند پچھلی شب اُس کے بدن کو بری طرح ادھیڑ چکا ہوگا..اور وہ اپنی اُدھڑی ہوئی حالت کی تشفّی اور لطف کی نیند میں اُس کی آواز نہ سنتی ہوگی..

''کیوں جا رہے ہو؟''

''میں..تمہیں بتانا بُھول گیا..وہ مجھے ''کمالِ فن'' کا ایک ایوارڈ دے رہے ہیں..فنون کی ترویج کا جو سرکاری ادارہ ہے اُس کے سربراہ نے درخواست ہے کہ میں اسلام آباد پہنچ کر اُس کے ہاتھوں سے یہ ایوارڈ وصول کروں..''

''اُس آرٹس کے ادارے کا سربراہ ان دنوں ایک ناکام ہکلانے والا اداکار تو نہیں ہے جس کا باپ ایک وڈیرے کا منشی تھا اور اتفاق سے وہ وڈیرہ ہمارا وزیرِ اعظم ہے..''

''وہی..''

''تمہیں شرم نہ آئے گی اُس.. احمق ہکلے سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے..''

''آئے گی.. لیکن ایوارڈ کے ساتھ دس لاکھ روپے کی رقم بھی تو ہے..''

''فک یُو..''

''کیا ہمیں اس دس لاکھ روپے کی اشد ضرورت نہیں ہے؟''

''ہے..''

''تو پھر..''

''پھر بھی فَک یُو..''

اگر واپسی ہوئی تو وہ کیا بہانہ کرے گا کہ اُس کی جیب میں دس لاکھ روپے کا چیک کیوں نہیں ہے..

■•◆•◆•◆•■

وہ سانس لینے کے رُکا.. بدن پسینے سے شرابور تھا اور جب اُس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا تو اُس کے کچھ قطرے جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے دُھند کے سفید جگنوؤں کے بدن پر گرے اور اُن کی ٹمٹماہٹ بجھنے لگی. منرل واٹر کی بوتل سے مُنہ لگا کر ایک گھونٹ بھرا.. پلٹ کر نگاہ کی..

قلعہ روہتاس کی پُر ہیبت اور بے مقصد فصیلوں کے پہلو میں بہتی ندی اس بلندی سے تھمی ہوئی لگتی تھی.. جیسے ایک رقاصہ کی بل کھاتی کمر دُھند میں حنوط ہو چکی ہو..

ہولے ہولے ٹیلے پر ہونکتے ہوئے چڑھتے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے بدن کے سب حصے مستعار شدہ ہیں.. بھان متی کا ایک کُنبہ ہیں یہاں تک کہ اُس کی رُوح کے اندر جتنے بھی خزینے پوشیدہ ہیں اُن سب کے سکّے اُس کی دھرتی سے باہر کی سرزمینوں میں ڈھالے گئے ہیں..

سب کچھ مستعار شدہ ہے.. عقیدے، روایتیں، ثقافت، شاعری یہاں تک کہ اُس کا اپنا نام بھی... اور تو اور اُس کے بیشتر اولیاء کرام نے بھی اجنبی سرزمینوں سے یہاں کا رخ کیا تھا.. وہ بھی درآمد شدہ تھے، وہ کسی بھی معاملے میں خود کفیل نہ تھا.. نہ مصوری میں اور نہ ہی ادب یا روحانیت اور فقہی مسائل میں.. اُس کی اپنی ذاتی شناخت نہ ہونے کے برابر تھی.. گویا وہ ایک نوعیت کا فرینکن سٹائن تھا جس کا ہر عضو مستعار شدہ تھا.. اُسے جوڑا گیا تھا.. مصوری اور ادب کے خلیے مغرب سے درآمد کیے گئے تھے.. شاعری ایران سے منگوائی گئی تھی، دل عرب کے صحراؤں کی ریت میں دھڑکتا تھا.. ہاتھ پاؤں طوران سے آئے تھے، زبان کے ذائقے سنٹرل ایشیا کے مرہونِ منت تھے اور زبان

خودتر کی وغیرہ سے آئی تھی..عجب ملغوبہ سابن گیا تھا جس کے سانسوں میں اپنی دھرتی کے موسموں کی کوئی مہک نہ تھی..وہ ایک ایسا آہو تھا جس نے اپنے سندھ اور سرسوتی کے نیلگوں پانیوں سے مُنہ موڑا اور دجلہ فرات کے گدلے پانیوں میں اپنی تھوتھنی ڈبو دی، پیاس نہ بجھی تو اس میں قصور کس کا تھا...ایسے آہو کے نصیب میں بے شناختی کے صحراؤں میں بھٹکنا لکھ دیا گیا ہوتا ہے..

اور لطف تو یہ ہے کہ ایسا فرینکن سٹائن زبردستی تخلیق نہ ہوا..وہ خود قانع ہو گیا کہ اُسے درآمد شدہ اعضاء سے تعمیر کیا جائے، وہ خود اپنے آبائی وجود سے منقطع ہوا..جس دھرتی میں اُس کی جڑیں اتنی گہرائی میں جا چکی تھیں جہاں آبائی دانش اور شناخت کے چراغ روشن تھے اُس نے خود فیصلہ کیا کہ وہ انہیں اکھاڑ کر ایران، طوران اور عرب کی زمینوں میں جڑیں پکڑے گا..اپنے آپ کو اُن ناآشنا زمینوں میں بودے گا..اور وہ بویا نہ گیا..ایک بے چہرہ، بے شناخت وجود ایک فرینکن سٹائن کی مانند دھپ دھپ چلتا اپنی تلاش میں بھٹکتا پھرا..وہ مختلف عقیدوں، ثقافتوں اور روایتوں کی دھجیوں سے تخلیق کردہ ایک بے جان گڈا تھا..

اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پہلی دھوپ کی کرنوں کو اپنے آبی بدن میں جذب کرتی رخشاں ہو رہی تھیں جب ایک عجیب واہیات سا خیال اُس کے ذہن میں آیا..پہاڑ بھی عشوہ گر عورتیں ہوتے ہیں، نہ چڑھنے دیتے ہیں اور پھر نہ اترنے دیتے ہیں اور تب..

اور تب اُس کی آنکھوں میں جو پسینے کی نمی اتر آئی تھی اس نے اُس کے پار دیکھا تو اُس کے راستے کی دھول میں سے تاریخ کا سامری بچھڑا یوں دمکتا لشکتا نمودار ہوا جیسے ابھی ابھی بنو اسرائیل کے سونے کے گہنے پگھلا کر اُسے ڈھالا گیا ہو..بے شک اُسے تو بے یقینی نے یکدم مار ڈالا لیکن بچھڑا بھی ٹھٹک گیا کہ اُس کا سامنا ایک اور مُوسلے سے تھا..اور وہ اُسے مسخر کرنے کی خاطر پوری

آب وتاب سے دمکنے لگا کہ اگر تو نے پرستش کرنی ہے تو کیا ایک جلتی ہوئی جھاڑی کی نسبت میں زیادہ پرکشش اور سحر انگیز نہیں ہوں.. جیسے تم نے وہاں اپنے جوتے اتارے اور سجدہ ریز ہو گئے تو جان لو کہ رہتی دنیا تک زمانے اُس جلتی جھاڑی کے نہیں میرے طلسم کے ہیں.. تو جھک جاؤ، مجھ پر ایمان لے آؤ کہ اسی میں تمہاری دنیاوی فلاح پوشیدہ ہے..

مُوسٰے حسین کے دماغ کے ایک ایسے خلیے نے سوچ کے ایک جھرنے کو جنم دیا جس میں ابھی تک مستعار شدہ بُھس نہیں بھرا تھا کہ.. یہ فتور ہے.. بھلا کوہ طور کے دامن میں سونے کے زیورات پگھلا کر تخلیق کردہ سنہری بچھڑا ٹلّہ جوگیاں کی چڑھائی کے دوران میرے سامنے کیسے آ سکتا ہے.. اگر آ گیا ہے تو یہ بھی شناخت کی بُھول بُھلیوں میں الجھ کر مجھے وہ مُوسٰے سمجھ رہا ہے جو ابھی ابھی کوہ طور سے اترا ہے.. اسے شدید غلط فہمی ہوئی ہے..

''میں وہ مُوسٰے نہیں ہوں..''

''میں جانتا ہوں کہ تم وہ مُوسٰے نہیں ہو اور میں بھی وہ سنہری بچھڑا نہیں ہوں لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ مُوسٰے اور سنہری بچھڑے کے رُوپ بدلتے رہتے ہیں.. یہ کبھی طے نہ ہوگا کہ پرستش کے لائق کون ہے.. تمہاری جلتی جھاڑی میں کلام کرنے والا یا میرا آنکھوں کو خیرہ کرنے والا سنہرا پن.. لیکن میں سامری کا تخلیق کردہ سنہری بچھڑا یہ جانتا ہوں کہ تم انکار کرنے والوں میں سے ہو.. وہ جو میرے زمانوں میں دس آسمانی احکام نازل ہوئے تھے وہ ان زمانوں میں متروک ہو چکے ہیں اور اُن کی جگہ جو نئے احکام اترنے والے ہیں تم اُنہیں وصول کرنے کی خاطر اس ٹلّے کی چوٹی پر پہنچنے کی خاطر اتنے کشٹ کاٹ رہے ہو..''

''تم کیا ہو؟''

''میں تمہاری تاریخ سے تخلیق کردہ وہ سنہری بچھڑا ہوں جس کی تم پرستش کرتے آئے ہو..

جانتے ہو تاریخ کیا ہے؟''

''اے نادان اگرچہ سنہری سامری بچھڑے کیا تم اس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ میں اپنی تاریخ کا ادراک نہیں رکھتا..''

''میں جانتا تھا کہ تم تاریخ کو صرف اپنے آپ تک محدود رکھنے والوں میں سے ہو... تاریخ یہ نہیں ہے اس کے فریب کی کوئی حد نہیں.. جاننا چاہتے ہو کہ دراصل تاریخ کی ماہیئت کیا ہے..''

وہ نہیں جاننا چاہتا تھا کہ تھکاوٹ نے اُسے بے دم اور نڈھال کر رکھا تھا لیکن وہ مجبور ہوتا گیا، سنہری بچھڑے کی جانب دیکھا تو اُس کی سنہری آنکھوں کے اُس سحر نے اُسے جکڑ لیا جو سامری نے اُسے تخلیق کرنے کے بعد اُس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا.. مُوسےٰ نے نظر بھر کر اُسے کو دیکھا تو وہ اُن میں سے پھوٹتے سحر سے جکڑا گیا.. ایک کبوتر کی مانند سہم گیا جس کی جانب بلّی دیکھتی ہے تو اُس کے پَر بے جان ہو جاتے ہیں..

سنہری بچھڑے کی کھنکتی آواز ٹلہ جوگیاں کی جھاڑیوں میں گونجنے لگی.. ''کیا تم سُن رہے ہو؟'' یہ آواز جانے کونسی کائناتوں میں جنم لے کر سفر کرتی اُس کے کانوں میں اتر رہی تھی ''سنو.. تاریخ.. نصابوں، کتابوں، مخطوطوں اور صحیفوں میں جتنی بھی درج ہوئی وہ دراصل تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے.. اس کے سنپولئے نصابوں میں سرسراتے ہر نسل کو گمراہ کرتے ہیں، مخطوطوں میں رینگتے ہیں اور صحیفوں میں زہر بھرتے ہیں اور یوں ہر نسل بخوشی گمراہ ہوتی چلی جاتی ہے اور صرف اپنی تاریخ کو ہی آخری سچ جان کر اُس کے دفاع کے لیے اپنی زندگیاں اجاڑتی اور قربان کرتی چلی جاتی ہے اور ہر نسل اپنی برتری ثابت کرنے کی خاطر اپنے آپ کو دلاواری اور ناقابل شکستگی کے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر اپنے عقیدے کو ہی آخری اور تنہا سچ ثابت کرنے کے لیے اُسے اپنے تاریخی سانچے میں ڈھال کر مسخ کرتی چلی جاتی ہے.. کیا تُم سن رہے ہو؟''

بچھڑے کی آنکھوں میں سے جادوگری کے جو سنہری تار شعاعوں کی مانند نکل رہے تھے وہ اُن سے بندھا گیا تھا، مفلوج ہو چکا تھا، اُس نے اپنے حنوط شدہ چہرے کو بمشکل ہلایا کہ ہاں میں سُن رہا ہوں..

''تاریخ ایک ایسی طوائف ہے جو زور آور زمینی خداؤں کے آنگن میں رقص کرتی ہے.. آسمانی خداؤں کی خواہشوں کے مطابق ڈھلتی جاتی ہے.. یہ دروغ گوئی، تعصب، تنگ نظری اور بے ایمانی سے گوندھی ہوئی ایسی مٹی ہے جسے تکبر، عروج اور تخت شاہی کے تابع چاک پر چڑھا کر ہر نسل اور ہر الوہی عقیدہ اپنی من مرضی کا کوزہ تخلیق کرتا ہے اور پھر اُس کُوزے کو سینے سے لگانے والے اُس میں گنگا جل اور نہ ٹھہرنے والے پانیوں کی نمی محسوس کرتے اپنے آپ کو دنیا بھر سے افضل قرار دیتے ہیں..اور یہ کوزہ منطق اور دلیل کی ہلکی سی آنچ سے ہی ڈھے جاتا ہے لیکن وہ احتیاط کرتے ہیں، منطق اور دلیل کا سایہ بھی اپنے ڈھالے ہوئے تاریخ کے کُوزے پر پڑنے نہیں دیتے..

تاریخ گھڑی جاتی ہے..

یہ خوابوں، سرابوں اور نسلی امتیاز اور عقیدوں کے تنکوں سے تعمیر کردہ ایک ایسا گھونسلا ہے جس کی تعمیر میں خرابی مُضمر ہے اور تم سب ان گھونسلوں میں روپوش اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے والے پرندے ہو، نہیں جانتے کہ تم سے پہلے بھی ایسے گھونسلے اقوام اور مذاہب نے تعمیر کیے جو زمانوں نے خس و خاشاک کر دیئے.. گہرے سمندروں کی عمیق گہرائیوں کی تہہ میں تاریخ، ایک ایسا کھلا ہوا آبی پھول ہے جسے اگر آپ سطح آب پر لے آئیں تو وہ حقائق اور منطق کی کڑی دھوپ کی تاب نہ لا کر ایک کچّے کُوزے کی مانند ڈھے جائے گا، تحلیل ہو کر.. پانی ہو جائے گا..آپ خالی ہاتھ رہ جائیں گے..تاریخ، تاریخ کا سب سے بڑا فریب ہے..

مُوئے حسین جس کے حواس اور ہاتھ پاؤں سامری کے تاروں سے بندھے مفلوج ہو چکے تھے، یکدم بحال ہو گئے کہ سنہری بچھڑا ایک آبی پُھول کی مانند ہی دُھند میں تحلیل ہو چکا تھا..

■•◆•◆•◆•■

ٹھوکریں کھاتا، سانس بمشکل سنبھالتا، کہیں دم لیتا مُوسےٰ حسین بار بار سر جھٹکتا تھا کہ جو دیکھا گیا وہ خواب تھا یا میں خود ایک خواب ہوں جو کسی سنہری بچھڑے کے خواب میں چلا گیا تھا..

اگرچہ ہر قدم میں اذیت کے تھوہر کانٹے چبھتے تھے پر وہ چڑھتا جاتا تھا..

جیسے ہر پُرشکوہ آسمانی بلندی کے دامن میں ایک ایسا مقام ہوتا ہے، ایک بیس کیمپ ہوتا ہے جہاں ذرا ٹھہر کر، اپنے آپ کو بحال کر کے، اُس بلندی کو اسیر کرنے کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے ایسے ٹلّہ جوگیاں کے دامن میں، قلعہ روہتاس کی بے مقصد اگرچہ پُرشکوہ فصیلوں کے سائے میں گوردوارہ پہلی پادشاہی سری نانک کی مقدس زوال پذیر عمارت ایک ایسا ہی مقام یا بیس کیمپ تھا جہاں سے چڑھائی کا آغاز ہوتا تھا.. بابا نانک نے اس مقام پر چالیس دن کا چلّہ کاٹا تھا، ٹلّہ جوگیاں کی چوٹی پر پہنچنے کی منصوبہ بندی کی تھی جہاں اُنہوں نے ایک مدت گیان دھیان میں بسر کی.. یہ گوردوارہ اب تو چمگادڑوں کا مسکن تھا، برابر میں جو سرور یا تالاب تھا اُس کے بساند بھرے پانیوں کی سطح پر کائی کی ایک دبیز تہہ بچھی تھی جس پر کبھی کبھار کوئی نادان پرندہ اُسے نیم سیاہ ہریاول کا ایک کُنج سمجھ کر اترتا اور جب اُس کے اترنے سے کائی حرکت میں آ جاتی تو وہ ہراساں ہو کر پھر سے پرواز اختیار کر لیتا.. اس تالاب کے گرد محرابوں کا ایک سلسلہ تھا جن میں کچھ ویران طاقچے گئے زمانوں میں جل چکے چراغوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے..

مُوسےٰ حسین نے پچھلی شب اسی کھنڈر عمارت میں بسر کی تھی اور پھر صبح سویرے چڑھائی کا

آغاز کیا تھا..بیس کیمپ ٹلہ جوگیاں!

ایک ہریاول کے رنگوں میں رنگے پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اُس کے بہرے ہوتے کانوں کی قربت میں ہوئی..اُس نے سرگوشی کی..تم اس ٹیلے پر چڑھنے کی کاوش میں ہلکان ہوئے جاتے ہو..ہر پتھر کا سہارا لیتے، اُس پر اپنی ہتھیلی جماتے چڑھتے جاتے ہو..اگر تم بخت آور ہوتے تو جبل نور کے پتھروں پر ہاتھ رکھتے اُن کا سہارا لیتے وہاں تک شاید پہنچ ہی جاتے جس کے غار شگافوں میں سے ایک شگاف میں میرا گھونسلا تھا..

مُوسےٰ حسین نے کچھ ہراساں ہو کر اپنے کانوں کی لوؤں کو چُھوا کہ ابھی تو کوہ طور کے دامن میں تخلیق ہونے والے سنہری بچھڑے نے تاریخ کے لیکچر پلا کر میرا سفر کھوٹا کیا تھا اور اب یہ پرندہ کہیں سے آ گیا ہے اگر وہم نہیں ہے تو کیا واقعی حقیقت میں آ گیا ہے..کانوں کی لووں کو چھوا تو اُن میں پرندوں کے پروں کی جو سنسناہٹ ٹھہری ہوئی تھی، وہ اُس کی اُنگلیوں میں منتقل ہوگئی..وہ حقیقت تھا..

''میں کہاں تک پہنچ جاتا؟''

''وہاں تک..''

''وہاں جبل نور میں کیا ہے؟''

''وہاں ثبت نشانیاں ہیں اُس کے پتھروں میں حنوط ہوچکی..''

''کس کی نشانیاں؟''

''قصویٰ کے سوار کی نشانیاں..جب وہ اس جبل کے دامن سے کوہ پیمائی کا آغاز کرتا تھا، چڑھتے ہوئے جس پتھر پر اپنی ہتھیلی رکھ کر سہارا لیتا بلند ہوتا تھا اُس کا سنگلاخ وجود اُس کے چھونے سے موم ہو جاتا تھا اور اُس کی ہتھیلی کے نشان اُس میں کُھب جاتے تھے..ہمیشہ کے لیے..محفوظ ہو

جاتے تھے.. ہر کسی کے بخت میں نہیں ہوتا کہ وہ نشانیاں اُس کو دکھائی دیں.. صرف دیکھنے والوں کے نصیب میں ہوتا ہے کہ جبل نور کو اگر وہ کسی اندھیاری شب میں ذرا فاصلوں سے دیکھیں تو پتھروں پر اُس کی ہتھیلیوں کی نشانیاں تاریکی میں نمایاں دِکھتی ہیں.. سیاہ رات میں وہ یُوں دمکتی ہیں کہ اُن ہتھیلیوں میں کل کائنات کی قسمت کی سب لکیریں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں پر تمہارے ایسے بخت کہاں.. تمہارے لیے بس یہی کافی ہے کہ تم راستے میں ٹھہر ٹھہر کر جس پتھر کو بھی تھام کر سہارا لیتے ہو جان لو کہ اُس پر تم سے پہلے اس ٹیلے پر پچھلے ہزاروں برسوں کے دوران چڑھنے والوں کی ہتھیلیوں کے نشان تو ہوں گے جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے..''

پھڑ پھڑاہٹ مدھم ہوئی، معدوم ہو گئی.... شاید واہمہ تھا، پرندہ نہ تھا جو سرگوشی کر گیا...

پر اِن پتھروں پر نقش تو ہوں گے.. جنہوں نے گئے زمانوں میں ٹیلہ پیمائی کی اُن سب نے اس کی بلندی تک جاتے ہوئے کہیں نہ کہیں سہارے تو لیے ہوں گے..

ـــ آ ؤ زمیں کھودیں.. اور اُس میں اپنے دل بو دیں
کریں سیراب اُنہیں اپنے پسینے سے
کہ اس جینے سے
نہ تم خوش ہو، نہ میں خوش ہوں..

تو چلو زمیں کھودیں.. مفروضوں کی زمیں کھودیں..

یہاں ٹلہ جوگیاں کے راستے کے پتھروں پر جتنے بھی متلاشی آئے، عشق یا اقتدار کی ہوس

میں آئے، خلقت کو سُکھ دینے یا آزار دینے غلام بنانے آئے اُن سب نے انہی پتھروں کا سہارا لیا، سانس درست کرنے کی خاطر ٹھہرے اُن پر اپنی ہتھیلیاں جمائیں تو اگر اُن کے نشان بھی ثبت ہوئے تو زمین مفروضوں کی کھود کرید دیکھتے ہیں کہ اُن کی پہچان کیسے ہو جائے، کونسے پتھر پر نقش ہتھیلی کا کس کا ہے.. مفروضے کو ایک پہیلی کر دیں، نام بے شک نہ لیں اُس کی پہچان نقش سے کریں کہ وہ کون تھا.. یہ بجھارت بوجھیں..

اب یہ جو نقش مٹنے کو ہے، اس پر زمانوں کی بوسیدگی کی کائی کی ایک تہہ جمی ہوئی ہے، کائی کو ہتھیلی سے سمیٹ کر ذرا جھانکیں.. اتنی برساتوں، کُہرے کی راتوں اور دہکتے ہزاروں موسموں، سب کی سب شدّت اور غضب اس نقش نے جھیلے، مدھم ہو گیا پر شناخت قائم رہی...

— کن وِچ مُندراں گل وِچ گانی..

واہ واہ رُوپ سجایا

تے چرخے دی گھوک سُن کے

کوئی جوگی نقش تھا ہزاروں برس کے موسم جھیلنے کے باوجود، زمانوں کی کائی سے ڈھکا ہوا، اس ٹیلے پر پہنچنے والا پہلا انسان، نیچے پھیلی کرود کی دنیا سے فرار ہونے والا جسے قرار نہ آتا تھا، جس نے وحشت میں اپنے کان پھاڑ لئے، اُن میں بالیاں پہن لیں، کن پھٹا جوگی.. اسی مقام پر اُس نے اپنے کانوں کا بلیدان کیا تھا کہ کائی سے ڈھکا ہوا جو مدھم نقش تھا، اُس پر گرنے والے خون کے دھبے بے انت برساتوں کے بعد دُھلے تو نہ تھے..

اور یہ نقش.. نخوت اور سکندری کے تکبّر کا ہے.. تاریخ کی بدبودار کائی اُسے ڈھانپنے کو ہے، اُسے اگلی سویر ایک ایسے بلند قامت شیر کے مُنہ میں جانا تھا کہ وہ اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہونے کے

لیے سپاہیوں کے تھامے ہوئے کسی زینے پر قدم نہ رکھتا تھا، اتنا قد آور تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا اُس پر چڑھ جاتا تھا جیسے وہ ہاتھی نہ ہو ایک پستہ قد گھوڑا ہو.. اگرچہ اُس کے ذاتی دیوتا بھی تھے جو ماؤنٹ اولمپس پر برہنہ دیویوں سے الوہی ہم بستری میں مشغول رہتے تھے، اُن کے ابدی کنوار پن میں ارغوانی مے چڑھانے کے باوجود ایک دراڑ تک نہ ڈال پائے تھے لیکن وہ اُس کی مدد کے لیے یہاں تک نہ آ سکتے تھے کہ راستے میں ایجین سمندر پڑتا تھا اور اُن کی آسمانی عملداری اس کے پار جانے سے قاصر تھی، ان کی خدائی جغرافیائی حدود میں محدود تھی، یوں تو اُسے خود بھی دیوتائی کا دعویٰ تھا لیکن پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین بہ ذات خود دیوی دیوتاؤں کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل تھی بلکہ اس کے بہت سے دیوی دیوتا زمانے گزرنے سے متروک ہوتے جاتے تھے.. اُسے ایک اور دیوتا کی حاجت نہ تھی چنانچہ اگلی سویر کے یُدھ کے لیے اُسے مقامی خداؤں کی مدد درکار تھی.. اور جب اُسے خبر ہوئی کہ اس ہاتھی شکل کے ٹیلے کی چوٹی پر ایسے کن پھٹے جوگیوں کا بسیرا ہے جو صدیوں سے گیان دھیان میں گُم ہیں، گائیوں کا دودھ فروخت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں اور اُن کی تپسیا میں قبولیت کا اثر ہے تو وہ اُن کی آشیرواد حاصل کرنے کے لیے اس ٹیلے پر چڑھتا گیا تھا، وہ کون تھا؟

ایک اور دُھندلاتا ہوا نقش ایک ہتھیلی کا تھا.. نوا پرداز ہندی، نکتہ آرا، نوائے ارجمند نقش.. ایک شاعر شہزادہ جو اپنا تخت تاج ترک کر کے انہی بلندیوں پر کوہ نورد ہوا تھا اور جس نے سنسکرت میں جو کچھ کہا اُسے مشرق سے ابھرتے ہوئے ایک سورج نے اپنی بھاشا میں ڈھالا..

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ٹلہ جوگیاں کے دامن میں چلّہ کاٹ کر ایک اور جوگی درویش ادھر آیا تھا جس نے کہا تھا کہ..

ے سچا ہے وہ آج بھی نانک۔ سچا ہوگا کل بھی وہ

اُس نے بھی تو انہی پتھروں کا سہارا لیا تھا، اُس کی ہتھیلی کے آثار بہت نمایاں تھے اور ''پنجہ صاحب'' کہلاتے تھے..

شاہ اور بادشاہ بھی بہت آئے اور ان میں میں ایک جو اپنی مذہبی رواداری کی خصلت کے باعث عظمت کے سنگھاسن پر بٹھایا گیا، اُس نے ٹیلے کے جوگیوں کے لیے اس کی چوٹی پر ایک تالاب تعمیر کیا اور جوگیوں کے عقائد کے بارے میں اُن سے گفتگو کی، اُس نے بہت سے مقامی مذاہب کی ندیوں کو ایک ایسے دریا میں ڈھالا جو اُس کے نام سے موسوم ہوا اگرچہ اُس کے رخصت ہوتے ہی وہ دریا پھر سے ندیوں میں بٹ گیا.. اُس کی ہتھیلی کی ثبت شدہ شکل بھی کسی ایک پتھر پر نقش تھی..

بہت آئے اور آخر میں ایک ایسا کرشن آیا جو ذرا نازک ملوک تھا، جس کی لٹیں مکھن سے چُپڑی ہوئی تھیں.. لیکن گائیوں کے نہیں، دریائے چناب کے کناروں پر چرنے والی اُن بھینسوں کے مکھن سے جو جنگل بیلوں میں اُگی ہوئی خودرو بھنگ کے بُوٹوں پر مُنہ مارتی مست ہوتی تھیں اور اُس کے ہاتھوں میں بھی کرشن کی مانند ایک ونجلی تھی.. کسی پتھر پر اُس کی نشانیاں بھی ثبت تھیں اور پہچان یُوں ہوتی تھی کہ اگر اُس پتھر کے ساتھ کان لگا کر سنو تو اُس میں سے ونجلی کی ایک صدا آتی تھی..

ے سُن ونجلی دی مٹھڑی تان وے..
میں تاں ہو ہو گئی قربان وے..

کچھ تو بوجھا گیا ہے کہ یہ کون تھے.. کچھ نہ کچھ تو سُوجھ گیا ہوگیا کہ ٹلہ جوگیاں پر چڑھتے ہوئے کٹھن راستوں میں جو پتھر ہیں اُن پر کن لوگوں کے آثار ثبت ہیں.. کون آیا پہن لباس کُڑے.. کون آیا تھا.. بس یہی تو بھارت ہے.. مفروضوں کی زمین کھودنے سے کچھ تو حاصل ہوگا.

■•◆•◆•◆•■

گوردوارہ سری پہلی بادشاہی کے تالاب کے گرد سرکنڈوں کا جنگل موسم سرما کی آمد کی خبر کرتا تھا کہ ہر سرکنڈے کے سر پر سفید پھولوں کے پھریرے لہراتے تھے.. موٗلے آج سویر ان سرکنڈوں میں بہت دیر اوپر جانے کے راستے کی کھوج میں بھٹکتا رہا.. وہ سرکنڈوں کی قد آور فصل میں سے گزرتا تو اُن پر نمودار ہوتے سفید ستوں کے پھولوں میں سے کچھ روئیں جدا ہوتے اور مائی بوڑھیوں کی مانند فضا میں تیرنے لگتے.. ہر جانب سرکنڈوں کی فصیلیں کھڑی تھیں اور اُن میں راستہ نہ ملتا تھا.. جیسے گنے کے کھیت میں داخل ہونے والا بھٹکتا پھرتا ہے..

محسوس تو یہی ہوتا تھا کہ یہ ایک واہمہ ہے.. یونہی کوئی ادھورا سا سراب ہے.. لیکن ایسا ہوا تھا کہ آج سویر جب وہ سرکنڈوں میں راستہ تلاش کرتا بھٹک رہا تھا تب بائیں جانب کی سرکنڈوں کی قد آور دیوار میں ایک خفیف سی لرزش نے جنم لیا.. ہوا نہ تھی.. اُس فصل کی گھناوٹ میں سے بھیڑیں ظاہر ہونے لگیں اور وہ تابع اور ڈرپوک نہ تھیں، سرکش اور قابو میں نہ آنے والی بھیڑیں تھیں.. کہ اُس کے دائیں بائیں اُسکی موجودگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے منمناتی بلکہ غراتی ڈھول اڑاتی گزر گئیں.. جیسے گمان کے پردوں میں سے ظاہر ہوئیں اور واہموں کے ایک جہان کی دھند میں روپوش ہو گئیں.. وہ ابھی سوچ میں تھا، اُس ڈھول کے ذرّوں کو اپنی ناک میں محسوس کر رہا تھا جب سرکنڈوں کو اپنے عصا سے ہٹاتا ایک پریشان حال گڈریا ظاہر ہوا، جس کے بال کاندھوں تک آتے تھے، پریشان حال اور ڈھول میں اٹا ہوا.. وہ ٹھٹک گیا..

''میں بھٹک گیا ہوں..'' مُوسٰے نے اُسے مخاطب کیا..

''میں تو نہیں میری بھیڑیں بھٹک گئی ہیں..'' گڈریے کے سیاہ بال اُس کے کھدر کے لبادے پر سیاہ ریشم کی مانند بہتے جاتے تھے ''تم نے دیکھی ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ میں نے اُنہیں دیکھا ہے.. وہ میرے اردگرد سے گزر کر پھر سے سرکنڈوں کے اندر روپوش ہوگئی ہیں..''

''مجھے اُنہیں راستہ دکھانا ہے، میں چلتا ہوں..''

''میں بھی تو بھٹک رہا ہوں..'' مُوسٰے کے چہرے پر ناراضی رقم ہوئی ''مجھے کون راستہ دکھائے گا..''

''دیکھو.. پانی پر چلنا آسان ہوتا ہے.. کسی مُردہ شخص کے چہرے پر پھونک کر اُسے پھر سے زندہ کرنا ایک معمول ہوتا ہے لیکن وہ کونسا راستہ ہے جسے اختیار کرنا ہے اس سے دشوار اور کوئی عمل نہیں ہوتا کہ ہر کسی کا راستہ الگ اور ذاتی ہوتا ہے اور وہ اس یقین کی زنجیروں میں ہمیشہ کے لیے، پیدائش سے دم آخر تک، اسیر ہوتا ہے کہ بس جس راستے پر میں نے قدم رکھا ہے، بس وہی وہ سیدھا راستہ ہے جو مجھے میرے عقیدے کی چوٹی پر لے جائے گا تو تم کس راستے کی جستجو میں ہو؟''

''مہاراج کرشن نے کہا تھا کہ وہ جو مجھ تک مختلف راستوں سے سفر کرتے پہنچتے ہیں تو میں آگے بڑھ کر انہیں اُسی راستے پر مل جاتا ہوں تو مجھے کوئی بھی راستہ دکھا دو.. میری غرض صرف چوٹی تک پہنچنا ہے، راستہ کوئی بھی ہو مجھے کچھ غرض نہیں..''

تب اُس گڈریئے نے شانوں پر گرتے بالوں کو جھٹکا اور اُن میں سے گرنے والے پسینے کے قطرے خون کی بوندوں میں بدل گئے، اور ہر بُوند میں حلّاج کی شکل ہویدا تھی کہ ان دونوں کے درمیان مصلوبیت کے رشتے تھے..

''کوئی بھی راستہ..'' مُوسےٰ نے پھر کہا..

گڈریئے نے اپنے عصا سے سرکنڈوں کو چھوا تو اُن کے درمیان ایک راستہ کشادہ ہوتا چلا گیا، سرکنڈے جو ابھی ٹھاٹھیں مارتے ایک سمندر کی مانند راستے میں حائل تھے، سمٹتے گئے اور اُن کی بیچ میں سے ایک پگڈنڈی نمودار ہوتی چلی گئی..

''تم اس پہاڑی راستے کو اختیار کرلو..سورج ابھی نیم خوابیدہ ہے، پانیوں پر ایک دُھند تیرتی ہے، ہر جانب ایک نیم تاریکی ہے تو جب اذن ہوگا کہ اے روشنی ہو جا تب تم اُس روشنی کے ہو جانے کے لمحوں میں چوٹی پر پہنچ جاؤ گے..''

مُوسےٰ حسین نے اُس کے پاؤں پر نگاہ کی..گڈریئے کے پاؤں میں تسمے اور چرمی جوتے تھے جو شاید طویل مسافتوں نے خون آلود کر دیئے تھے..جیسے اُن میں میخیں ٹھونک دی گئی ہوں..غارِ حرا کے مکین کے پاؤں میں بھی اسی نوعیت کا پہناوا تھا جس پر لگی گانٹھیں اُس کے ہاتھوں سے مرمت شدہ تھیں..اور ہر گانٹھ میں ایک دل تھا..گڈریا اپنی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں سرکنڈوں میں داخل ہو کر اوجھل ہوا تو اُس کے نقشِ پا خون آلود راستے کی مٹی پر ثبت اُس کی گزران کی نشانیاں تھے..

روشنی تو کب کی ہو چکی لیکن ابھی تک کچھ آثار نہیں معبدوں اور جوگیوں کے گھونسلوں کے..گڈریئے نے تو کہا تھا کہ جب اذن ہوگا کہ روشنی ہو جا تو اُن لمحوں میں تم چوٹی پر پہنچ جاؤ گے..مسافت بے انت ابھی باقی لگتی ہے، ایسی جھاڑیاں ہیں جن کے پتوں میں سے کوئی نامعلوم ناگوار مہک پھوٹتی ہے جو میرا سر چکراتی ہے..پتھر ہیں جن پر کچھ نقش ثبت ہیں تو پھر منزل کہاں ہے..

کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنے بستر پر پڑا ایک گمان میں ہوں، نہ کسی ٹِلّے کا، نہ ہی کسی بلندی کا وجود ہے اور میں اپنے گمان میں مبتلا ایک لاحاصل کوہ پیمائی کی خوابناکی کے فریب میں

ہوں.. کیا یہ کل حیات ایسی ہی کوہ نوردیوں سے عبارت ہے جو سراسر گمان اور فریب کی کائناتیں ہیں اور وہ جو منزل ہے، اگرچہ نہیں ہے، اور اگر ہے تو اُن بے حساب نوری برسوں کی مسافت کے بعد بالآخر قاف کی کائنات کے پردے میں روپوش تمہارا اپنا ہی چہرہ مقابل میں ہے، پردہ اٹھتا ہے تو آپ کے سامنے آپ ہی جلوہ گر ہو تو پھر اتنی طویل ریاضتوں اور مسافتوں کو اختیار کرنے سے فائدہ.. لاحاصل کو جو خود آپ ہیں اُسے حاصل کرنے کی جستجو میں اپنے آپ کو مصلوب کرنے سے کیا حاصل.. وہیں اپنے گھونسلے میں بیٹھ رہو، ذرا اپنے اندر جھانک لو، گھونگھٹ کے پٹ کھول کر نظارہ کر لو، انا الحق کی گوری اُسی گھونگھٹ میں شرماتی منتظر ہے.. کیوں در بدر بھٹکتے ہو.. جھانک لو اپنے وجود کی رگوں اور شریانوں میں گردش کرتے لہو کی ہر بوند میں اور ہر بوند میں ایک آئینہ ہے اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تُو ہے..

''مُوسے..'' اُسے کسی نے جھنجھوڑا..

''کون؟''

''اور کون ہو سکتا ہے بے وقوف.. تم رات کب واپس آئے، اتنی خاموشی سے بنا آہٹ کے میرے برابر میں کر لیٹ گئے کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی.. وہ ایوارڈ لے آئے..؟''

''کونسا ایوارڈ..''

''ایک بوگس اداکار کے ہاتھ سے دیا جانے والا تمہاری کُل حیات کی تخلیقی مشقتوں کی قیمت کمال فن ایوارڈ.. کیا وہ اب بھی ہکلاتا ہے.. محض دس لاکھ روپے کے لالچ میں اپنے آپ کو ذلیل کروا آئے..''

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، میں وہاں نہیں گیا تھا..''

''میں جہاں گیا تھا میں ابھی تک وہاں ہوں.. میں ابھی ایک پہاڑی راستے کی مسافت

میں ہوں.. میرا راستہ کھوٹا نہ کرو.. ہمارے ہاں اولاد نہ ہوگی.. پُورن نے مجھے خبر کردی تھی..''

''کون پُورن؟''

''جو ابھی تک اپنے کنویں میں بے دست و پا پڑا ہے..''

''فگ پُورن..''

وہ جہاں کہیں اپنے تھکاوٹ سے بوجھل پاؤں دھرتا وہاں گھاس میں سے ٹڈے اُچھلنے لگتے.. وہ اُن کی اچھل کود سے محظوظ ہونے لگا، کبھی رُک جاتا تو وہ ٹڈے بھی اُچھلنے سے رُک جاتے اور وہ اس خیال میں گیا کہ مجھ سے پیشتر ان دو ہزار برسوں میں جتنے لوگوں نے بھی یہ پہاڑی راستہ طے کیا اُن سب کے پاؤں دھرنے سے ٹڈے اُچھلے ہوں گے اور یہ اُن ٹڈوں کی جانے کونسی ہزارویں نسل تھی جو آج اُس کے پاؤں کے آس پاس اچھل رہی تھی...

وہ پھر سے ایک دوسرے کو اپنے آمنے سامنے پا کر ٹھٹک گئے..

دائیں جانب کی جھاڑیوں میں سے وہی چرواہا.. پریشان حال نمودار ہو، اُس کے چہرے پر مُوئے کی پہچان کا کچھ شائبہ ظاہر نہ ہوا ''میری کچھ بھیڑیں گم ہوگئی ہیں، کیا تم نے دیکھی ہیں؟''

''تم نے آج سویر مجھے کون سے راستے پر ڈال دیا تھا کہ ابھی تک بھٹک رہا ہوں.'' اُس نے گڈریئے سے شکایت آمیز لہجے میں کہا..

اور اُس لمحے اُس پر ایک عجب انکشاف ہوا، وہ اس گڈریئے کی ذات، صفات اور بھیس کے بھید جان گیا.. وہ ذات کا ترکھان تھا کہ لکڑی کو رندہ کرتے ہوئے اس پر سے جو باریک چھلکے اترتے ہیں وہ اُس کے لبادے پر جگہ جگہ اٹکے ہوئے تھے بلکہ اُس کی داڑھی کے بالوں میں بھی الجھے ہوئے تھے.. اُس کے باریک چہرے پر اذیت اور دُکھ کی دراڑیں تھیں اور اُن دراڑوں میں بھی

بُرادے کے کچھ ذرّے دفن تھے جیسے اس نے خلق خدا کے کل گناہوں کو اپنے سر لے لیا ہو.. ہاں یہ وہی تھا جو مصلوب کر دیا گیا اور اُس کے رب نے اُسے ترک کر دیا، غفلت اختیار کر لی تبھی تو اُس نے صلیب پر فریاد کی.. کبھی پانیوں پر چلتا اور کبھی مُردوں کو زندہ کرتا مسیحا وہی ابن مریم تھا جو یروشلم کی پتھریلی گلیوں کی ڈھلوانوں پر اپنے کاندھے پر اپنی ہی صلیب اٹھائے اور تب اُس کی تسموں والی جُوتیوں میں اُس کے کومل پاؤں خون آلودہوتے تھے.. ایسی ہی چرمی تسموں والی گانٹھوں سے بھری وہ جُوتیاں تھیں جو طائف میں خون آلود ہوئیں..

مُوسٹے نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو.. اُس کے سر پر کسی کیکر کے کانٹوں کا تاج آویزاں تھا.. یہ وہی تھا..

گڈریا اُس کی موجودگی سے بے پرواہ اپنی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں پھر سے جھاڑیوں میں روپوش ہونے کو تھا جب مُوسٹے نے اُس کا راستہ روک لیا..

''ٹھہرو.. ٹھہر جاؤ.. اے ابن مریم میرے دُکھ کی بھی تو دوا کرتے جاؤ.. سنتے جاؤ.. میں نے تمہیں پہچان لیا ہے.. لیکن تمہارے چہرے پر میری پہچان کا کوئی پرندہ نہیں پھڑ پھڑاتا.. نہیں پہچانتے.. تب تم میری جانب کب نگاہ کرتے تھے کہ آج مجھے پہچان جاؤ تو میں تمہیں یاد دلاتا ہوں.. یوروشلم کی گلیوں کے اُن گھڑے کھردرے پتھروں پر اور ہر پتھر پہلے پتھر سے بلند سطح پر ہوا جاتا تھا اور تم کاندھے پر صلیب اٹھائے، اُن گلیوں میں یوں خون آلود پاؤں سے گھسیٹتے تھے کہ تمہارا دم نکلتا تھا.. تم ایک نازک ملوک اپنی ماں کے لاڈلے نوجوان تھے اور تمہارے کاندھوں پر خلقت خدا کے سب گناہوں کا بوجھ صلیب کی صورت لاد دیا گیا تھا، پیاس سے تمہارا حلق سلگتی ریت کا ایک صحرا ہوتا تھا.. اور وہی خلق خدا جس کے گناہوں کا کفارہ تم اپنے کاندھوں پر اٹھائے گھسیٹتے اُن گلیوں میں چڑھتے تھے تم پر لعن طعن کرتی تھوکتی اور بدزبانی کرتی تھی اور پھر کوئی نہ کوئی تم پر ایمان رکھنے والا اُرومی سپاہ کی کڑی نظروں سے چوری

چھپے تمہارے حلق میں پانی کی کچھ بوندیں ٹپکا دیتا تھا..وہ جو تم پر دشنام کرتے تھے وہ تمہارے آبائی عقیدے اور نسل کے لوگ تھے جنھوں نے تمہیں اپنا بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا تھا..ایک بن باپ کا بیٹا، ایک بڑھئی ترکھان، لکڑی پر رندہ چلا کر رزق حاصل کرنے والا کیسے سلمان کے معبد کا وارث ہو سکتا تھا..اُس معبد کے پجاریوں کی بھرے بازار میں تذلیل کر سکتا تھا..

تو اے گڈریئے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے..لیکن تم نے مجھے کہاں پہچانا ہوگا کہ تم اپنے دائیں بائیں کہاں نظر کرتے تھے..تمہارے آگے اگر ایک اور شخص اپنی صلیب اٹھائے پتھروں پر گھسٹتا جاتا ہے تم کہاں دیکھتے تھے..یہ میں تھا اے کانٹوں کے تاج والے..ذرا میرے چہرے کو برسوں کی قدامت کے پار جا کر غور سے دیکھو..یہ میں ہی تو تھا جو تم سے آگے تم سے بھی بھاری ایک صلیب کاندھوں پر اٹھائے اُن پتھروں پر اپنے خون آلود پاؤں کے سرخ نقش ثبت کرتا چڑھتا تھا..میری ہڈیوں میں سے اذیت اور تھکن کا گودا پھوٹ پھوٹ کر میرے گھٹنوں اور ٹخنوں میں سے امڈ امڈ کر میرے خون آلود پاؤں کے زخموں پر بچھتا تھا، تم اپنی اذیت میں مبتلا جب کہ تمہاری آنکھوں میں پسینے کی بجائے لہو کی بوندیں گرتی تھیں کہاں اپنے آگے گھسٹتے ایک اور شخص کے وجود سے واقف ہو سکتے تھے..میں تمہیں موردالزام نہیں ٹھہراتا..

مجھے ایک نظر دیکھو..میں وہی چور ہو..

تمہارے برابر میں جو تین صلیبیں گڑی تھیں اُن میں سے دوسری پر میرے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونکی گئیں..

بے شک تمہارا دعویٰ سچ تھا، تم بن باپ کے وہ بیٹے تھے جو اپنی نسل کی بادشاہت کے لیے اتارا گیا تھا، اپنی بھٹکتی ہوئی بھیڑوں کا چوپان بن کر آیا تھا اور تمہیں ہم تین چوروں کے ہمراہ اس لیے مصلوب کر دیا گیا کہ وہ تمہیں تنہا مصلوب نہ کرنا چاہتے تھے..

اے گڈریئے تو نے تو معبدوں میں براجمان پروہتوں کے بوسیدہ عقائد سے بغاوت کی، سلطنت روم کی اطاعت نہ کی، تمہارا کچھ نہ کچھ تو قصور تھا.. میرا کیا قصور تھا؟ وہ تمہیں اُس پہاڑی کی بلندی پر تنہا مصلوب نہ کرنا چاہتے تھے، یوں ثابت ہو جاتا کہ تمہیں بغاوت کے جرم میں سزا دی جا رہی ہے.. اور یوں بھی ایک بلند پہاڑی پر ایک تنہا مصلوب کو دیکھ کر عقیدت کی داستانیں جنم لیتی ہیں چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ کچھ اور لوگوں کو چور قرار دے کر تمہیں اُن کی رفاقت میں پھانسی پر چڑھایا جائے.. یہ ایک انتظامی مصلحت تھی، انہیں بہانے درکار تھے.. چنانچہ انہوں نے مجھے.. جب میں سمندر میں سے اپنے رزق کے لیے مچھلیاں پکڑ رہا تھا انہوں نے مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا کہ تم ہفتے کے روز مچھلیاں شکار کرنے کے مُرتکب ہوئے ہو، آسمانی احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہو کہ اس روز مچھلیوں کے شکار کی ممانعت ہے.. تم ہتک کے مجرم ہو اور تمہاری سزا موت ہے.. اور میں نے آسمانی احکام کے خلاف احتجاج تو کیا کرنا تھا بہت منت سماجت کی کہ میری کیا مجال کہ میں کوہ طور کے عقیدے سے انحراف کروں پر انہوں نے ایک نہ سُنی.. مجھے گردن سے دبوچنے والے یروشلم پر قابض رُومی نہ تھے، ہیکل سلمانی میں صدیوں سے براجمان طویل داڑھیوں والے وہ مُجاور تھے جن کے غضب سے کچھ فرار نہ تھا.. آسمانی احکام کی ہتک کا الزام اگر لگ گیا تو لگ گیا.. اس کی تحقیق اور تفتیش کی کچھ حاجت نہیں چنانچہ مجھے چوری اور آسمانی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر موت کی سزا سنا دی گئی.. اُنہیں تمہارے ہمراہ کچھ اور صلیبیں ایستادہ کرنے کے بہانے درکار تھے.. بقیہ دو جو مصلوب ہوئے اُن کی کہانی بھی کچھ مختلف نہیں..

تمہارا تو کچھ قصور تھا، میرا کیا تھا؟

میں تم سے زیادہ معصوم اور مظلوم تھا..

تمہارا کچھ تو گناہ تھا.. میں تو بے گناہ مارا گیا..

میں اُن گلیوں میں اپنی بے گناہی کی بھاری صلیب گھسیٹتا تم سے کہیں بڑھ کر اذیت میں تھا.. کہ اردگرد جو ہجوم تھا وہ مجھ پر تو نگاہ ہی نہ کرتا تھا. صرف تمہیں نفرت یا عقیدت سے تکتا تھا.. کسی نے میرے پیاسے حلق میں پانی کی ایک بوند نہ ٹپکائی تھی، کوئی بھی میرا ہمدرد نہ تھا، غضب میں آئے ہوئے اُس ہجوم میں سے کوئی نہ کوئی ہمدرد یا تو تمہارے رخساروں کو چھو کر سرگوشی کرتا تھا کہ اے میرے گناہوں کے کفارے میں مصلوب کیے جانے والے کنواری مریم کے بیٹے، تم ابد تک ہمارے گڈریئے، ہمارے چوپان رہو گے اور.. میں.. نہ کوئی عقیدت سے میرے رخسار چھوتا تھا اور نہ مجھ سے ہمدردی کرتا تھا کہ اُن کی نظروں میں، میں ایک چور تھا.. بلکہ مجھے وہ سب کہاں دیکھتے تھے، صرف تمہیں دیکھتے تھے.. یُوں میں آج تک گمنام رہا...

تو ہم دونوں میں سے مظلوم کون تھا..

مجھے صرف تمہاری موت کی تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے مصلوب کیا گیا.. اے گڈریئے.. میری موت کے ذمہ دار تم ہو.. دراصل تم نے مجھے مصلوب کیا.. اور آج تم مجھے پہچانتے نہیں.. اور تمہیں تو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا، اور مجھے اسی زمین پر گرا دیا گیا.. تمہاری تو موج ہو گئی ...آزمائش تمام ہوئی اور میں تب سے اپنی صلیب سے اتارا نہیں گیا.. میرے نصیب میں آسمان نہ تھے..

اور آج تم مجھے پہچان نہیں رہے.. خلقِ خدا کے گناہوں کی پاداش میں تم نہیں.. میں مصلوب ہوا تھا.. نہیں پہچانتے؟

تم کہاں مجھے پہچانتے ہو، تم تو ایک ایسے خمار میں تھے جس کی سرحدیں ہوس سے جا ملتی ہیں، پارسائی، پیغمبری اور نامہ بری کا بھی ایک خمار ہوتا ہے جس میں ہوس کی آمیزش ہوتی ہے.. اپنے عقیدے کی پاداش میں مصلوب ہو جانے کی خواہش بھی ہوس سے جنم لیتی ہے.. جان سے

جانے کے لطف بھی نرالے ہوتے ہیں.. اگر میں یہ کہوں کہ اُن گلیوں میں اپنے ناتواں بدن سے بھاری صلیب کو پشت پر اٹھائے جب اُسے گھسیٹتے تھے تو تم اُس اذیت سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے..

یہ لطف اندوزی بہرحال میرے بخت میں نہ تھی کہ میں تو بے وجہ مارا جارہا تھا.. اور تم کسی نہ کسی وجہ سے مارے جارہے تھے..

اگر تم شک کرتے ہو کہ میں خواہ مخواہ اپنی ذات تم سے منسلک کر کے، ایک داستان گھڑ کے تمہارے پہلو بہ پہلو تاریخ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تو میں وہاں اپنی موجودگی کے کچھ ثبوت پیش کرتا ہوں جو تم جھٹلا نہ سکو گے.. میں ایک چشم دید گواہ کے طور پر اُن چودہ منزلوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں جنہیں طے کر کے ہم اُس مقام تک پہنچے جہاں ہمیں صلیبوں پر آویزاں کر کے ٹھونک دیا گیا..

اس طریق آلام کے چودہ پڑاؤ تھے.. جمعہ کا دن تھا، پورے تین بجے تمہارا سفر شروع ہوا اور جو راستہ تم نے طے کرنا تھا وہ چھ سو میٹر طویل تھا اور ہموار نہ تھا، اونچا ہوتا چلا جاتا تھا..

پہلے پڑاؤ پر رومی سپاہیوں نے تم پر تشدد کیا، یروشلم کے لوگ تمہارا مذاق اڑاتے رہے اور تمہارے گرد فقرے کستے ناچتے رہے..

دوسرے پڑاؤ پر تمہاری پشت پر صلیب باندھی گئی اور تمہیں کانٹوں کا ایک تاج پہنایا گیا جس کے کانٹے تمہارے رخساروں اور ماتھے میں چبھ گئے اور ان خراشوں سے خُون رِسنے لگا.. تماشائی تمہاری تضحیک کرتے یہودیوں کا بادشاہ کے نعرے لگاتے تمہیں بے توقیر کرتے رہے..

تیسرے پڑاؤ پر تم صلیب کے بوجھ سے نڈھال ہو کر گر گئے تھے..

چوتھے پڑاؤ پر تمہاری ماں مریم نے تمہارے چہرے کے زخم پونچھے تھے..تم قلیل الطعام (کم خوراک) اور قلیل المنام (کم نیند والے) تھے چنانچہ صلیب کے بوجھ سے بار بار گرتے تھے..

پانچویں پڑاؤ سے ایک ڈھلان کا آغاز ہوا جو اَل جل جثہ کہلاتی تھی..

چھٹے پڑاؤ پر محترمہ ویرونیکا آگے آئیں اور اپنے رومال سے تمہارے چہرے کا خُون پونچھا..یہ رومال آج بھی روم کے سینٹ پیٹرز کلیسا میں محفوظ ہے..

ساتویں پڑاؤ پر تم ناتوانی کی تاب نہ لاکر پھر گر گئے..

آٹھویں پڑاؤ پر تمہاری خفیہ پیروکار عورتیں آہ و بکا کرتی تھیں تو تم نے ٹھہر کر اُن سے خطاب کیا اور سپاہیوں نے تم پر کوڑے برسائے..

نویں پڑاؤ پر زخموں سے نڈھال تم پھر زمیں بوس ہو گئے..

اگرچہ مجھے تمہاری ان اذیتوں اور آزمائشوں سے خوش ہونا چاہیے تھا کہ تمہاری صلیبی تنہائی کم کرنے کے لیے مجھے بھی ایک چور قرار دے کر مصلوب کیا جا رہا تھا لیکن..میں تمہاری رُسوائیوں سے راضی نہ ہوا، دُکھی ہوا، اور جب انہوں نے اگلے پڑاؤ میں تمہاری تحقیر کرنے کے لیے تمہیں برہنہ کر دیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا..میں زور زور سے چیخنے لگا، رومی سپاہیوں کو گالیاں دینے لگا..رُومی سپاہی میری زخمی پُشت پر کوڑے برسانے لگے اور میں تقریباً مدہوش ہو گیا اور تب تم نے پہلی بار مجھ پر نگاہ کی اور اس میں تشکر کی ایک نامعلوم مسکراہٹ تھی..آخری پڑاؤ تک رات ہو چکی تھی..

اور جب انہوں نے تمہارے نڈھال زخم آلود ناتواں بدن کو صلیب پر کھینچا اور..مجھے یاد ہے..مجھے یاد ہے..پہلی میخ اُنہوں نے تمہاری بائیں ہتھیلی میں ٹھونکی..تو اُس میں سے لہو کی ایک بُوند پھوٹی اور مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے، اُس بُوند میں سے ایک پرندے نے جنم لیا تھا..اور اُس پرندے

سے مجھے نفرت ہوگئی کہ وہ بعدازاں دریائے اُردن کے پانیوں کو اپنی چونچ میں بھر کر تمہارے کُھلے منہ میں ٹپکاتا تھا اور مجھ سے تغافل برتتا تھا..

مصلوب تم بھی ہوئے اور ہم بھی ہوئے.. دونوں بے گناہ ہوئے.. بلکہ تمہارے تو کچھ گناہ تھے، میرے تو کچھ نہ تھے..

کیا اب بھی تم میری پہچان سے انکاری ہو سکتے ہو..

گڈریئے کی سیاہ آنکھوں میں حیرت کے پکھیرو فریاد کرنے لگے، انکار کی فاختائیں کُوکنے لگیں، وہ ششدر کھڑا تھا کہ یہ بوڑھا جو حواس کھویا ہوا لگتا ہے، بار بار میرے سامنے آجاتا ہے تو یہ جو بھی کہتا جا رہا ہے میرے پلّے تو نہیں پڑتا.. اس سے پرے رہنا چاہیے..

"صاحب جی.." وہ لجاجت سے بولا.. اُس سے خوفزدہ ہوتا "قلعہ روہتاس کی فصیلوں کے اندر جو ایک گاؤں آباد ہو چکا ہے میں وہاں کا ایک غریب بڑھئی ہوں، گزر اوقات کے لیے لوگوں کی بھیڑیں چراتا ہوں.. یہ بھیڑیں میری نہیں ان کا مالک کوئی اور ہے.. ٹلّہ جوگیاں کی چڑھائی کے دوران شہر والوں کے سانس پھول جاتے ہیں، پیاس سے نڈھال ہو کر عجب باتیں کرنے لگتے ہیں.."

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمد عیسےٰ.."

"تو پھر تم وہی ہو.."

"میں کوئی بھی نہیں سرکار.. آپ پانی پیو.." اُس نے کمر سے بندھی چھاگل کا ڈھکنا کھول کر اُس کی جانب بڑھا دی..

مُوئے طیش میں تھا، اس نے چھاگل پرے دھکیل دی اور گڈریئے کو قہر آلود آنکھوں سے

گھورا ''مجھے آج اس کی حاجت نہیں ہے.. تم نے تب تو مجھے پانی کی پیشکش نہ کی جب تمہارے پیروکار تمہاری جانب پانی سے لبریز کوزے اگرچہ چوری چھپے بڑھاتے تھے اور میں اُن ڈھلوان گلیوں کے پتھروں پر اپنی صلیب گھسیٹتا پیاس سے بدحال ہوتا تھا. تم تو ایک سپرسٹار تھے، عوام الناس کے پسندیدہ، مقبولیت کے چراغوں کی روشنی میں سر سے پاؤں تک روشنی میں نہائے ہوئے.. عوام میں مقبولیت صلیب کا بوجھ بھی ہلکا کر دیتی ہے.. پھانسی کا پھندا بھی گلے کو زیادہ نہیں گھونٹتا اور میں.. مجھے تم نے خواہ مخواہ مروا دیا.. اگر تم نہ ہوتے تو میں اب بھی مزے سے دریائے اردن میں سے مچھلیاں پکڑ رہا ہوتا.. تم نے مجھے چور بنا دیا اور خود خدا بن بیٹھے.. تم میرے دکھ کی دوا کرتے تو میں تمہیں طبیب تسلیم کرتا.. تم میری مسیحائی نہیں کر سکتے..''

گڈریا اُس کی بے ربط اور بہکی بہکی باتوں سے بیزار ہو چکا تھا، اُس نے چھاگل کا ڈھکن اُس کے منہ پر جمایا، کمر کے گرد باندھا اور چلتے ہوئے کہنے لگا ''میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں.. رب راکھا..''

''تو پھر تمہارے سر پر کانٹوں کا تاج کیوں آویزاں ہے..''

گڈریئے کا ہاتھ بے اختیار ہو کر اٹھا اور اُس کے بالوں تک گیا، وہ کراہ اٹھا، اُس کی ہتھیلی میں جیسے کانٹوں کی میخیں ٹھونک دی گئی ہوں..

اپنی پونی ٹیل اٹھلاتی وہ لڑکی، کسرتی بدن اور سینے سے چسپاں مختصر مگر گٹھی ہوئی چھاتیوں والی جس کی ٹانگیں لانبی اور گھڑی ہوئی لگتی تھیں، پھر سے جھاڑیوں کے ایک جُھرمٹ میں سے جوگنگ کرتی نمودار ہوئی، وہ بھی اُسے سامنے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی..

''تم کون ہو؟''

''میں کیا جانوں کہ میں کون ہوں.. اور تم..''

''وہی.. جس سے تم ڈرتے ہو.. زندگی!''

وہ گڈریا اور وہ پونی ٹیل والی لڑکی.. شعور کی نہیں، لاشعور کی رو میں بہتے جاتے ہیں اور اس رو میں زمانے روانی میں ہیں اور ہر زمانے کی کشتی کے بادبان مرگ سیاہی میں ڈوبے ہوئے ہیں، بادبان کیا کالی چمگادڑوں کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پر ہیں اور ان پر وجود اور لاوجود کے چراغ کبھی جل اٹھتے ہیں اور کبھی بھڑک کر بجھ جاتے ہیں، یہ چراغ نہ جلانے سے جلتے ہیں اور نہ بجھانے سے بجھتے ہیں کہ ان چراغوں میں مذہب، تاریخ اور ثقافت کا، دلیل اور منطق کا جو تیل انڈیلا گیا ہے اُس میں شک شبہے کے پانیوں کی بھی آمیزش ہے اور آپ جانیئے پانی ملا تیل کبھی جل اٹھتا ہے اور کبھی بھڑک کر بجھ جاتا ہے.. اس تیل کی پہلی بُوند تب کشید ہوئی تھی جب ابھی پانیوں پر دُھند تیرتی تھی اور ان میں سے پانیوں میں سے حیات کی نمود ہوئی تھی، ممنوعہ پھل نہ تو سیب تھا اور نہ گندم کی بالی.. جنسی ملاپ تھا..

■◆◆◆◆◆◆◆■

دن دسمبر کے تھے..

پر عجب دن تھے..

ہر قدم پر موسم کچھ اور کے اور ہو جاتے..

جیسے تیز ہواؤں کی زد میں آنے والی کسی کتاب کے ورق پھڑ کتے اُڑتے جاتے ہیں، پل میں کوئی ایک عبارت اور اگلے پل میں کوئی اور تحریر..

وہ سانس لینے کے لیے تھم جاتا، تھکاوٹ سے مُچور، پسینے سے شرابور اور جونہی وہ رُکتا پسینے کے قطرے برف کی بوندوں میں منجمد ہو جاتے وہ بے اختیار یوں ٹھٹھرنے لگتا جیسے سنولیک کے برف انباروں میں برہنہ کھڑا ہو.. جوگرز میں جکڑے پاؤں جن کی جرابیں ابھی پسینے سے نچڑ رہی ہوتیں وہ سردی کی شدت سے اکڑ جاتیں، تسمے کسی فوجی آمر کی مونچھوں کی مانند.. وہ بھی اکڑ جاتے اور جونہی وہ پھر سے ہمت کر کے سفر اختیار کرتا.. نہ صرف ماتھے پر جمی برف بوندیں پھر سے پسینہ ہو جاتیں بلکہ جوگرز کی جرابیں بھی پگھل کر نچڑنے لگتیں اور اس کا پورا بدن گرمی کی شدت میں پھنکنے لگتا جیسے کسی تنور میں جھونک دیا گیا ہو.. اُس کے سینے کے بال، اُس کی مردانگی کی آخری علامت یوں سُلگ اٹھتے جیسے کسی نے اُنہیں دیا سلائی کے شعلے سے جھلسا دیا ہو.. اور اگلے لمحے پلک جھپکتے ہی اُنہی دہکتے ہوئے تنوروں کے پیندوں میں سے پانی پھوٹنے لگتے، بارش کی بوچھاڑیں اُس کے بدن کو چھید کر رکھ دیتیں.. برساتیں کُل سمندروں کے پانی بادلوں کی چھاگلوں میں بھر کر تلہ جوگیاں پر یُوں

انڈیلنے لگتیں کہ اُس کے جوگر پانیوں پر بطخ کے پنجوں کی مانند چپوؤں کی طرح چلنے لگتے.. وہ ڈوب بھی سکتا تھا..

بے شک دن دسمبر کے تھے..

اگر ایک مرتبہ پھر وہ ممکنات کی زمین کھودتا تو عین ممکن تھا کہ اُس میں سے کوئی لوح محفوظ برآمد ہو جاتی اور اُس پر کندہ ہوتا کہ اے مُوئے تم ماورا ہو چکے ہو موسموں اور زمانوں سے.. تحلیل ہو چکے ہو اُسی دھند میں جو تخلیق کے پانیوں پر کبھی ٹھہری ہوئی تھی، ذرا سوچ کرو ٹھہر کر.. اپنے جوگرز پر نگاہ کرو ان کے تلے جو مٹی آتی ہے اُس کے ہر ذرّے میں تم سے پیشتر وجود میں آنے والے اربوں کھربوں انسانوں کے بے انت تابوت دفن ہیں.. تم کیا اور تمہارا وجود کیا جس پر تم اکڑے پھرتے ہو زمین پر تکبّر سے پاؤں دھرتے ہو.. تمہارے قدموں تلے دنیا کے کل ساحلوں کی ریت ہے اور ریت کے ہر ذرّے میں بے انت زمانوں کی قبریں ملفوف ہیں.. بے شمار کھوپڑیوں کی راکھ ہے.. کوئی ایک کھوپڑی تو نہیں جسے دیکھ کر تمہیں خیال آئے کہ یہ شخص بھی تو کبھی میری طرح جیتا جاگتا ہوگا.. اگر حالیہ زمانوں کی قربت میں کہیں جیتا تھا تو یہ بھی میری مانند صبح سویرے شیو کر کے رخساروں پر اولڈ سپائس آفٹر شیو لوشن لگاتا ہوگا.. بدن پر یُوڈی کولون کی خوشبوئیں چھڑکتا ہوگا اور کیا میں نے بھی یہی کھوپڑی ہو جانا ہے.. تو پھر کیوں نہ میں خود سے ہی سوال کر لوں کہ.. ٹُو بی آر ناٹ ٹُو بی! قدموں تلے صرف مٹی نہ آتی تھی، پتھر بھی آتے تھے اور ان پتھروں پر احتیاط سے قدم رکھو کہ ان میں سے کوئی بھی آسمان سے گرا ہوا ایک میٹرائٹ ہو سکتا ہے، سیاہ رنگ کا ہو سکتا ہے، حجرِ اسود بھی ہو سکتا ہے.. تو آخر کس کس پتھر کو بوسہ دیا جائے.. بہتر یہی ہے کہ احتیاط سے قدم دھرو.. حجرِ اسود پر نہ سہی کہ تم ایک بودھی ستوا یا کرشن پر بھی قدم رکھ سکتے ہو کہ کوئی بھی پتھر ایک خدا کی صورت تراشا جا سکتا ہے..

اُس کے کانوں میں، کچے کانوں میں، پیدائش کے فوراً بعد جو اذان دی گئی تھی تو گویا وہ

پابند کر دیا گیا تھا..اُس کی حیات کی تختی پر کالی کملی والے کی اطاعت اور عشق کے پُور نے رقم کر دیئے گئے تھے جنہیں زندگی بھر اُس نے گوڑھا کرتے چلا جانا تھا..وہ روگردانی کا مرتکب نہ ہو سکتا تھا اور کیوں ہوتا..انسان نے کسی نہ کسی عقیدے کے کھونٹے سے تو بندھنا ہوتا ہے، وہ چاہے تو بھی کُھل نہیں سکتا تو کیوں رسّہ تُڑوانے کے جنون میں اپنی جان سے جائے، عافیت اسی میں ہے کہ بندھا رہے..جب تک مالک نہ کھولے بندھا رہے..

اور شام ڈھلے سارا دن ہریاول کے کھیتوں میں من مرضی سے چرنے کے بعد سر جھکا کر مالک کی مرضی کے تابع گھر چلا جائے جہاں اگر وہ نصیب والا ہو تو کوئی چراغ جلتا ہوگا ورنہ اندھیاروں میں اتر جانا اُس کا مقدر ہے..

موسموں کا تغیر تھمنے میں نہ آتا، رُت بدلنے میں آنکھ جھپکنے کا ایک پل..موسم کے سرد گرم اور بھیگے ہوئے تھپیڑے اُسے ایک شکستہ بادبانوں والی کشتی کی مانند لیے پھرتے تھے اور وہ کسی پہاڑی ندی کے ایک تنکے کی مانند بے بس اور بے اختیار بہتا جاتا تھا..

اُس کی ہر ٹھوکر میں بے انت زمانے ٹھکرائے جاتے تھے..

ہواؤں میں ارتعاش تھا..

موسموں کا تغیر تھم چکا تھا اور اُس پر جھکا آسمان ایک گہرے سکوت میں جا چکا تھا..ایک چُپ چاپ چُپ، ایک خاموش خاموشی کی چادر ہر سُو تنی ہوئی تھی، ایسی چُپ کے اُس کے سانسوں کی آواز دھم دھمک اُس چادر پر دستک دیتی تھی جب..یہ چادر کھڑکھڑانے لگی، جیسے تیز ہواؤں کی زد میں آ گئی ہو..ایک ارتعاش نے جنم دیا..اُس کے بدن میں بھی ایک لرزش لرزنے لگی اور وہ سہم گیا..کیا آسمانوں سے نئے صحیفے اتر رہے ہیں، تازہ احکام نازل ہو رہے ہیں یا کسی وحی کا نزول ہو رہا ہے.. میرا بدن اگر کانپ رہا ہے تو اس کا سبب کیا ہے..مجھ ایسے شخص پر تو کچھ نازل نہیں ہو سکتا سوائے

عذاب کے..تو پھر یہ مسلسل سرسراہٹیں کیسی ہیں، جیسے سروٹوں کے جنگل میں تیز ہواؤں کا شور..بانس کے آپس میں جُڑے ہوئے درختوں میں نقب لگانے والا چور..سرکتی ریت کی آہٹیں..خزاں رسیدہ پتوں میں سرکتا ایک خزاں رنگ سانپ..ارتعاش ایسا تھا جو اُس کے کانوں کے پردوں کو لرزاتا تھا..جیسے فرشتوں کے لبادے عرشِ بریں کے فرش پر گھسٹ رہے ہوں..مُوسےٰ نے اپنا سہم دور کرنے کی خاطر اوپر نگاہ کی..

پرندے تھے..

وہ ٹلّہ جوگیاں کی جانب لپکے چلے آتے تھے..

یہ اُس کی نگاہ تھی جس نے اُنہیں تسخیر کر لیا..

وہ اُس کے سر پر سے گزرنے والے تھے، اُسے دیکھ کر وہ بھی سہم گئے..ٹھٹک گئے، فضا میں ٹھہر گئے یوں کہ اُن کے پَر تو پھڑ پھڑاتے تھے لیکن اُن کی پرواز معطل ہو گئی تھی..جیسے اُس کی نگاہ نے اُن پر سحر پھونک دیا ہو..وہ اپنے اپنے مقام پر رُک گئے، گمان ہوتا تھا کہ وہ ابھی گر جائیں گے..وہ ٹھہر گئے..ارتعاش اُن کے پھڑ پھڑاتے پروں کا مدھم ہو گیا..

اُن کی پہچان میں کچھ دشواری نہ ہوتی تھی کہ وہ سب الگ الگ رنگوں اور زمانوں کے تھے..اگرچہ وہ سب کسی ایک ہی رنگ میں رنگے جانے کی چاہت میں گھونسلوں سے نکلے تھے..اپنے ہی مُرغ بادشاہ کی تلاش میں ادھر ٹلّہ جوگیاں آ نکلے تھے جب کہ انہیں تو مخالف سمت میں کسی قاف پہاڑ کا مسافر ہونا چاہیے تھا..

وہ جس نے فاقہ زدہ بُدھ کی پسلیوں میں سے یوں جنم لیا تھا جیسے آدم کی پسلیوں سے حوا کی پیدائش ہوئی تھی..طُور کی جلتی جھاڑی سے جھلسا ہوا، ایک مصلوب شخص کے حلق میں اپنی چونچ سے بوندیں ٹپکانے والا، غارِ حرا کے ایک شگاف میں قرنوں سے بسیرا کرنے والا..ان تینوں پرندوں

کی شکل میں اگرچہ کچھ فرق تھا لیکن پھر بھی اُن میں کوئی نہ کوئی قدر مشترک تھی جو انہیں ایک مشترکہ بندھن میں باندھتی تھی.. البتہ وہ ایک جس کا گھونسلا کرشن کی بانسری کے سوراخوں میں ہوا کرتا تھا، بقیہ تین پرندوں سے سہما سہما ان کی ڈار میں شامل ہو گیا تھا.. وہ اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ اُن کے نزدیک پرندگی کا سچ صرف اُن کے پروں میں روپوش کر دیا گیا تھا.... اُن کے حلق دریائے نیل، دریائے اردن اور مدینے کے جھرنوں سے تر ہوتے تھے.. کرشن پرندے کی پیاس صرف گنگا کے پانیوں سے ہی بجھتی تھی..

وہ آٹھوں موسےٰ کے سر پر سائبان ہو گئے.. معلّق ہو گئے.. تھم گئے..

مُوسےٰ بھی ٹھہر چکا تھا، تھم گیا تھا.. اُن پرندوں کو اپنے اوپر یوں معلّق دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا.. ''میرے سر پر کیوں سوار ہو گئے ہو.. اگر میری مانند بلندیوں کے مسافر ہو تو اپنی راہ لو.. جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ میرا راستہ کھوٹا نہ کرو..''

''ہم ٹھہر سکتے ہیں، کیا جانئے ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہوں..''

''نہ ٹھہرو.. میں خود بے خبر ہوں کہ میری منزل کونسی ہے.. تمہیں تو خبر ہو گی تو جاؤ..''

اُن میں سے جو سب سے بزرگ اور برتر پرندہ تھا جس کے پر جھلسے ہوئے تھے وہ اپنی موقوف شدہ پرواز جاری کرنے والا تھا جب اُس نے اپنے پھڑ پھڑاتے پروں تلے چڑھائی کی مشقت میں مبتلا اُس شخص کو غور سے دیکھا اور وہ ایک مرتبہ پھر سچ کی تلاش میں عبور کی جانے والی سات وادیوں میں سے ایک حیرت کی وادی میں پھر سے گم ہونے لگا.. اس شخص کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا.. اُس کی شکل میں ایک قدیم شناخت کے پرتو جھلکتے تھے جیسے کسی خانقاہ کے کھنڈروں کی کھدائی کے دوران مٹی میں ہزاروں برسوں سے دفن ایک ایسا مجسمہ ظاہر ہو جائے جس کے پتھر چہرے پر ابھی تک نور اور جمال کے عکس جھلکتے ہوں..

جھلسا ہوا پرندہ بمشکل حیرت کی وادی میں سے پر پھڑ پھڑاتا ہوا نکلا اور اُس شناسا لگتے چہرے سے سوال کیا ''تم کون ہو؟''

''میں کبھی لاجواب نہیں ہوا سوائے اُس شخص سے جس نے مجھ سے پوچھا ہو کہ تو کون ہے..''

''مجھے زچ نہ کرو.. میں نے ابھی اُس نیشاپور پہنچنا ہے جس نے اپنا جغرافیہ بدل لیا ہے.. جانے یہ والا نیشاپور ابھی کتنی مسافتوں کی دُوری پر واقع ہے تو مجھے دور کے اس شہر پہنچنا ہے.. میرا راستہ کھوٹا نہ کرو.. بتادو کہ تم کون ہو؟''

''میں مُوسےٰ ہوں..''

پرندہ جو ابھی ابھی حیرت کی وادی میں پھڑ پھڑاتا نکلا تھا اُس شخص کی قدیم شناخت سے آگاہ ہوگیا.. اُسے تو پہلے ہی شک ہوگیا تھا..

''تو یہ تم ہو؟''

''میں کون ہوں؟'' مُوسےٰ نے ہکلا کر کہا.. یہ کیا تھا کہ جونہی اس پرندے نے اُس کے سر پر اپنی پرواز معطل کی تھی اُس کی زبان میں گرہیں پڑنے لگی تھیں جیسے وہ کسی سلگتے ہوئے کوئلے سے داغی گئی ہو..

''ہاں یہ تم ہو.. میں نے تم سے شکایتیں کرنی ہیں کہ تمہاری جستجو کی پاداش میں میرے بال و پر جل اٹھے.. کوہ طور پر اگر ہر شب ایک الاؤ جلتا دکھائی دیتا تھا تو تمہیں کیا تکلیف تھی کہ تم اپ[نی] بھیڑوں اور اہلیہ کو ترک کر کے اپنا عصا تھام کر اُس کے کھوج میں چل نکلتے.. آرام سے ا[پنے] جھونپڑے میں قیام کیوں نہ کیا کہ وہ الاؤ تو تب سے سلگتا تھا جب سے یہ کائنات وجود میں آئی تھ[ی] اُسے سلگنے دیتے.. تب تک میں اُس جھاڑی کے دامن میں اپنے بال و پر سلامت رکھے اپنے گھو[نسلے]

میں چین سے تھا.. پھر تم چلے آئے، ہم کلام ہونے کے لیے تو وہ جھاڑی یوں بھڑک اٹھی کہ میں اُس کے شعلوں کی زد میں آ کر اپنے بال و پر جلا بیٹھا گویا اپاہج ہو گیا. صرف تمہاری مداخلت کی وجہ سے.. اور اب میرے جھلسے ہوئے پَر پرواز کے دوران ایک اپاہج فقیر کی مانند آسمانوں کی گلیوں میں گھسٹتے پھرتے ہیں.. میں دیگر پرندوں کی مانند ناک کی سیدھ میں نہیں اڑ سکتا، کبھی دائیں جانب لڑھکتا جاتا ہوں اور کبھی بائیں جانب ایک بے سدھ پتنگ کی مانند ڈولتا جاتا ہوں.. اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہوں.. مجھے تم سے بہت شکایتیں ہیں مُوسے.. میں اچھا بھلا پرندہ تھا، تم نے مجھے اپاہج کر دیا. تم جانتے ہو ناں کہ میں تب سے تھا، جب آغاز ہوا تھا..''

''اور جب آغاز ہوا تو خدا نے زمین اور آسمان تخلیق کیے اور زمین کی کوئی شکل یا ساخت نہ تھی اور ایک خلاء تھا اور تاریکی، گہرائی کے چہرے پر رقم تھی اور خدا کی رُوح پانیوں کی شکل پر حرکت کرنے لگی اور خدا نے کہا ''روشنی ہو جا'' اور روشنی ہو گئی..''

''خدا نے جس لمحے کہا کہ روشنی ہو جا تو اُس خلاء اور پانیوں کی تاریکی میں سے پہلا ذی روح میں تھا جس نے جنم لیا اور میرے وجود میں زمین اور آسمان بھر دیے گئے تھے، میں نے ہی اس خلاء کو پُر کیا اور سکوت کے شیشے کو اپنے ان پروں سے جو تب جُھلسے ہوئے نہ تھے، کرچی کرچی کر دیا.. وہ جو خدا کی روح پانیوں پر تیرتی تھی وہ میرے نومولود بدن کے اندر سرائیت کر گئی کہ اُسے پناہ درکار تھی، اگر میں نے انا الحق کا دعویٰ کیا تو کیا بُرا کیا.. اور جب میں اُن پانیوں میں سے پھڑ پھڑاتا نمودار ہوا تو وہ پانی جو ازل سے سکوت اور خلاء میں ایک تاریکی میں سانس تک نہیں لیتے تھے، زندہ ہو گئے.. میرے پروں کی جھنکار سے اُن پانیوں میں سے بے انت ایسی بوندوں نے جنم لیا جو ایک

جھرنے کی مانند بہتی ورد کرتی تھیں.. مجھے اپنی پیدائش کی پہلی شب کہیں نہ کہیں تو بسر کرنی تھی، تب میں کسی پناہ گاہ کی آرزو میں اڑا..وہ زمین جو ابھی چند لمحے پیشتر تخلیق کی گئی تھی، اُس پر اڑا..اڑا تو میں نے نیچے نگاہ کی، میرے پروں تلے عجب عجائب منظر وجود میں آ رہا تھا کہ تخلیق کا عمل ابھی کاملیت اختیار کر رہا تھا.. پیدائش تو ہو چکی تھی لیکن جو خدوخال خلق کیے گئے، جو صورتیں تصویر کی گئیں، زمین کی جو نین نقش تراشے گئے وہ ابھی کاملیت کی جانب بڑھ رہے تھے، واضح اور پہچان کی قربت میں ہو رہے تھے.. میرے پروں تلے ابھی ایک خلاء تھا اور ابھی اُس خلاء میں سے کونپلیں پھوٹتی تھیں، سربلند ہوتی چلی جاتی تھیں زمین کو گھنے جنگلوں سے ڈھکتی چلی جاتی تھیں..ریت ابھی تو ذرہ ذرہ بھٹکتی پھرتی تھی اور ابھی مجتمع ہوتی سمٹتی بے انت صحراؤں میں تبدیل ہو رہی تھی.. پہاڑیوں جیسے اس زمین کو مستحکم کرنے کی خاطر میخوں سے اس میں گاڑ دیئے گئے ہوں، وجود کے پتھریلے وجودوں کی کائنات کی صورت وجود میں آ رہے تھے..عجب عجائب منظر میرے پروں تلے مکمل ہو رہے تھے اور وہی پانی جن پر خدا کی روح تیرتی تھی جن میں سے میں نے جنم لیا اپنے الوہی وجود کے حصار توڑ کر اس زمین پر پھیلے دریاؤں میں ڈھلتے، بے پایاں سمندر ہوتے جاتے تھے..اُن پانیوں کی ہر بوند کے کوزے میں خدا کی رُوح کے کرشمے محفوظ ہو رہے تھے..کونپلوں کی کوملتا میں، ریت کے ہر ذرّے میں، ہر بوند میں سے اناالحق کی سرگوشیاں جنم لے رہی تھیں اور ایسا تو ہونا ہی تھا کہ خدا کی روح اور اُس کی پھونک سے وجود میں آنے والے سب وجودوں کے اندر اُس کی روح اور پھونک کے کچھ شائبے بھی تو شامل ہو چکے تھے..گویا صرف میں ہوں جو پہلا گواہ ہوں، اس زمین اور کُل کائنات کے سب بھیدوں کا رازداں ہوں اور جب نومولود صحراؤں کی ریت کے ذرے ابھی تک یوں مجتمع ہونے سے مفاہمت نہ کر پا رہے تھے، پہلو بدلتے سرکتے تھے، اپنی انفرادیت کھو دینے کے صدمے سے دوچار سلگتے تھے جب ان صحراؤں کے بیچوں بیچ یکدم میری آنکھوں کے نیچے ایک بھورے رنگ کا

خشک چٹانی سلسلہ نمودار ہوتا ابھرتا دکھائی دینے لگا..وہ ابھی ابھرنے اور بلند ہونے کی منازل طے کر رہا تھا اور پھر میری نظروں کے سامنے وہ کامل ہو کر حرکت سے سکوت میں بدل گیا..وہ ٹھہر گیا اور ابھی وہ ایک ویران تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور اگلے لمحے اُس کی چوٹی پر ایک چنگاری گری، وہ جو روشنی ہو جا کی آگ تھی اُس کی ایک چنگاری اس کی چوٹی پر آ گری اور روشنی ہوگئی..یہ اسی روشنی کا تسلسل تھا جو میری آنکھوں کے سامنے بھڑک اٹھا تھا اور میری آنکھیں بھی ان گنت چراغوں کی مانند اُس روشنی سے چراغاں ہوگئیں اور میں اُس کی جانب لپکتا چلا گیا..یہ میں نہ تھا وہ تھا جو مجھے اُس روشنی کی جانب لیے جاتا تھا..مجھے اپنے گھونسلے کی راہ دکھلاتا تھا..چٹانوں کے اس پر شکوہ پہاڑ کی چوٹی پر اُس کی ویرانی کے درمیان باریک پتوں والی ایک خاردار جھاڑی تھی جس کے چراغ میری آنکھوں میں روشن تھے پر یہ جھاڑی کسی آگ کے سپرد نہ کی گئی تھی..شعلے نہ تھے..اُس کے پتوں کی گھناوٹ میں سے ایک دھند آلود روشنی بہتی جاتی تھی..نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، دور سے وہ آگ ہی دکھائی دیتی تھی..تب میں نے اُس جھاڑی کے پہلو میں اُسی کے تنکوں سے ایک آشیانہ ایک ایک تنکا ایک ایک چونچ کر کے بنایا اُسے اپنا گھر کیا اور بسیرا کر گیا..میں تو اسی خیال میں تھا کہ یہ جو ازل ہے اور وہ جو ابد ہوگا تب تک میں اس میں قیام کروں گا..میرے بہت سے جنم ہوں گے، میں بے انت بار مروں گا لیکن اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم لیے چلا جاؤں گا اور ایسا ہی ہوتا چلا گیا..میں وہاں سُکھ چین کی زندگی کر رہا تھا، نور کی قربت میں تپش نہیں ہوتی، ایک آسودگی اور ایک الوہی خمار ہوتا ہے، بے شک ایک چراغ کے اندر ایک اور چراغ ہے جس میں آئینے ہی آئینے ہیں اور ہر آئینے میں تو ہی تُو ہے اور تیری قربت کا خمار ہے، نور، آگ نہیں ہوتا جو بھسم کر دے بلکہ جو کچھ بھسم ہو چکا ہے وہ اُس کی بے جانی میں سرایت کرتا اُسے جاندار کرتا ہے..میری چراغ اندر چراغ آسودگی کے خمار کے دن تب تمام ہوئے جب تُو اپنی لاٹھی ٹیکتا آ گیا..وہ جھاڑی جس کی اوٹ میں میرا بسیرا تھا..جس میں

سے نور کی دودھیائی بہتی ہوئی میرے آشیانے کو پُرنور کرتی تھی، اُس جھاڑی میں آگ لگ گئی، میرے بال و پر جھلس گئے اور میں ایک اپاہج پرندہ ہو گیا. تمہاری جستجو نے مجھے بھی جلا ڈالا. تم اس پہاڑ کے دامن میں پھیلے صحرا میں.. اپنے اُس مصر سے جہاں تم کبھی فرعون کے لاڈلے اور آسیہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، جب دھتکارے گئے کہ جاؤ اس لق و دق صحرا کے دوزخ میں اور اس میں جتنے بھی بچھو، چھپکلیاں، سانپ اور رینگنے والے ہیں اُن پر حکومت کرو، اپنے عصا سے انہیں مطیع کرو اور پھر ایک بزرگ اور برتر شعیب نام کے شخص نے اپنی بیٹی صفورہ تم سے بیاہ دی اور تم اُن کی بھیڑیں چراتے ایک صحرائی حیات بسر کرتے تھے تو پھر کیوں ایک جذب اور وارفتگی کی کیفیت نے تمہیں مغلوب کیا، جستجو کے ہاتھوں مجبور ہوئے، اس پہاڑ کی چوٹی پر ہر شب جو روشنی تمہیں دکھائی دیتی تھی اور دیگر صحرانشیں اس یقین کے اسیر تھے کہ یہ رب کی روشنی ہے اُس کی کھوج میں کوہ پیمائی اختیار کی.. اور جونہی تم نے چوٹی پر قدم رکھا تو خدا تم سے ہم کلام ہوا.. نور سے نور و نور جھاڑی میں سے اُس نے تم سے کلام کیا اور تم.. چونکہ یہ زمین مقدس تھی، اپنے پھٹے ہوئے جُوتے اتار کر جھاڑی کے آگے سجدہ ریز ہو گئے اور وہ بھڑک اٹھی.. یُوں کہ میرے بال و پر بھی سُلگ اٹھے اور میں اڑان کے قابل اتنا نہ رہا. تو اے مُوسےٰ اگر آج میں ایک مرتبہ پھر سچ کی تلاش میں طُور سے اڑان کر کے، قاف کے پہاڑ کی جانب نہیں، جوگیوں کے اس پہاڑ کی جانب چلا آیا ہوں تو یہاں بھی تم ہی موجود ہو.. میں نے اس لیے طُور کو ترک کیا کہ وہ جھاڑی کب کی سرد ہو چکی ہے، اُس کی آگ بجھ چکی ہے.. اور یہاں تم پھر موجود ہو.. پھر سے مجھے مکمل طور پر جلا دینے کے لیے.. میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پہلو میں تمہارا ترجمان بھائی ہارون موجود نہیں اور تمہاری زبان ابھی تک انگاروں سے جلی ہوئی ہے تو بے شک ہکلا کر بولو.. کوہ طور پر بھی تو ہارون تمہارے ہمراہ نہیں تھا اور تم یوں کلام کرتے تھے جیسے تمہاری زبان میں کوئی گرہ نہیں ہے تو آج بھی بولو.. مُوسےٰ مجھے تم سے بہت شکایتیں ہیں..''

''میں مُوسٹے حسین ہوں اور حسین بہت زمانوں بعد آیا اور وہ بھی مصلوب ہوا.. میں وہ مُوسٹے نہیں ہوں..''

''تم بھی انکاری ہو.. اُس گڈریئے کی مانند جو عیسےٰ ہونے سے انکاری تھا.. چلو ہر انکار میں ایک اثبات پنہاں ہوتا ہے.. نفی اثبات کے پانی ایک ہی جھرنے سے پُھوٹتے ہیں تو میری راہنمائی کردو.. نئے نیشاپور کو کون سا راستہ جاتا ہے..''

وہ بزرگ و برتر پرندہ اپنے جھلس چکے بال و پر کے دُکھ میں مبتلا ڈولتا ہوا پھر سے آسمانوں کا مسافر ہو گیا..

مُوسٹے وہ مُوسٹے نہ ہونے کے باوجود مجرم محسوس کر رہا تھا جب اُن آٹھوں میں سے نسبتاً قدیم ایک ایسا پرندہ جس کی آنکھیں نروان کے خمار میں بندھی ہوئی تھیں، ناتواں فاقہ زدہ اتنا کہ اُس کی چونچ بھی سکڑ گئی تھی.. پنجے پژمردہ اور پنکھ مُرجھائے ہوئے تھے، اُس کے کومل بدن کی ہڈیاں بھوک کی شدت سے ڈھانچہ ہو رہی تھی، گنی جا سکتی تھیں، نروان کی وادیوں میں جانے کب سے دُھونی رمائے بیٹھا تھا اور اُس پر انکشاف ہو چکا تھا کہ یہ دُکھوں کی نگری ہے.. دُکھ سبھائے جگ.. اُس سے مخاطب ہوا.. میں ایک مدت اپنے مہاتما کی پسلیوں میں گھونسلا بنائے مقیم رہا لیکن نہ وہ آخری سچ تک پہنچا اور نہ میں اُس سے آشنا ہوا.. بُھوک، تپسیا اور خلق خدا سے الگ ہو کر جنگلوں میں اگر سچ مِلتا تو وہ مجھ پر آشکار ہوتا.. اسی لیے میں عطار کی پوٹلی میں پناہ گیر ہوا.. کیا جانئے کہ جو کچھ گیا کے ایک پیپل کے درخت تلے مجھے نہ ملا وہ مجھے ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر اُس قدیم زیتون کے درخت تلے نصیب ہو جائے... آج کے نیشاپور کی جانب کونسا آسمان جاتا ہے..

اس شانت پرندے نے کچھ شکایت نہ کی پھر سے اڑان بھر گیا..

آسمانوں سے جو ارتعاش اترا تھا وہ مدھم ہوتا پھر سے ایک چُپ چاپ میں چلا گیا..

وہی پونی ٹیل والی لڑکی جس کی گردن کی سفیدی پر وہ پونی ٹیل بل کھاتی ایک سنپولئے کی مانند لہراتی تھی جوگنگ کرتی چلی آئی..

''یوں بُت بنے حیراں کیوں کھڑے ہو..کوہ نوردی تو حرکت سے عبارت ہے تو حرکت کیوں نہیں کرتے.''

''مجھے یہ پرندے زچ کرتے ہیں..''

''کونسے پرندے..''پونی ٹیل لڑکی کی گردن ٹھہر گئی..

''یہی جو مجھ سے مسلسل شکایت آمیز ہیں کہ میں وہ مُوئے ہونے سے کیوں انکاری ہوں..''

''کونسے پرندے..آسمان ویران پڑا ہے.. پرندے نہیں ہیں..''

''ہیں..''

''اگر ہیں تو محض گمان اور خبط کے پرندے ہیں..زندگی سے ڈرتے ہو..''

وہ جیسے آئی تھی متوازن اور نپی تلی چال کے ساتھ ویسے ہی جوگنگ کرتی سرکنڈوں میں روپوش ہوگئی..

پسینہ پُونچھتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو ڈھارس دی''آسمان شفاف ہے، وہاں کوئی پرندے نہیں ہیں..اگر ہیں تو محض گمان اور خبط کے ہیں..''

''ہم ہیں، ہم ہیں..''جواب نازل ہوا..''ہم گمان اور خبط کے نہیں آگہی کے پرندے ہیں..جو تمہارے بدن کی ڈالیوں پر براجمان ہو کر پیدائش، آخرت، حیات بعد از موت کی اُلجھنیں سلجھاتے ہیں..کبھی خود بھی اُلجھ جاتے ہیں..''اور پرندہ جو دیگر پرندوں کی ترجمانی کر رہا تھا جب کبھی

پر پھڑ پھڑاتا تو اُن میں سے لہو کی بوندیں تھراتی ہوئی ٹپکنے لگتیں جیسے اُس کے پروں میں میخیں ٹھونکی گئی ہوں ''بے شک اُس نے شکایت کی اپنے رب سے کہ تو نے مجھے کیوں ترک کر دیا لیکن میں نے اُسے ترک نہ کیا.. البتہ مجھے ایک قلق ہے کہ اُس کے برابر میں جن دو چوروں کو صرف اس لیے مصلوب کیا گیا تا کہ وہ اُسے بھی مصلوب کرنے میں حق بجانب ہو جائیں کہ یہ بھی ان میں سے ایک تھا.. اور وہ جو دائیں جانب اپنی صلیب پر کھینچا گیا تھا اُس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ممانعت کے دن مچھلیاں پکڑ رہا تھا.. قلق مجھے یہ ہے کہ میں نے اُس کی جانب دھیان نہ کیا، اُس کے اذیت سے بلکتے پیاسے حلق میں اپنی چونچ سے پانی کی ایک بُوند بھی نہ گرائی.. جانے کون تھا..''

''تم بھی نہیں پہچانتے، وہ میں تھا..''

لیکن لہو کی بوندوں سے بھرا وہ پرندہ اُس کی بات سنے بغیر رخصت ہو چکا تھا..

آسمان واقعی سنسان ہو گیا.. وہ ایک مرتبہ پھر پسینہ پونچھتا اس کوہ پر چڑھنے لگا.. اُس کے پاؤں میں جیسے لوہے کے بھاری باٹ باندھ دیئے گئے تھے، اٹھتے ہی نہ تھے.. بار بار خیال آتا کہ میں واپسی اختیار کر لوں لیکن مُڑ کر دیکھتا تو وہاں بھی اترائی کی بجائے ایک کوہ گراں دکھائی دیتا، نجات کی کوئی سبیل نہ تھی.. اس کے سوا چارا نہ تھا کہ وہ سفر جاری رکھے.. اور اُسے ایک مرتبہ پھر گمان ہوا کہ حیات کی مانند یہ سفر بھی لا حاصل تھا.. اگر لا حاصلی ہی مقدر تھی تو پھر نہ ہی چلتے جانے میں نجات تھی اور نہ ہی لوٹنے سے کچھ حاصل تھا.. اُس کے کانوں میں ہواؤں کی سرسراہٹ کے سوا ایک اور ارتعاش نے جنم لیا.. یقیناً ایک اور پرندہ تھا.. وہ اسے ڈانٹنا چاہتا تھا کہ اے پرندے میں تنگ آ چکا ہوں، عاجز آ چکا ہوں تمہاری داستانیں سنتے سنتے.. مجھے ایک اور داستان درکار نہیں.. اور وہاں اُس کے سر پر ایک اور پرندہ پھڑ پھڑاتا معلق تھا اور وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر اُس سے کلام کرتا تھا.. میں پیچھے رہ گیا تھا..

مُوسے نے بیزاری سے آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا.. وہ ایسا انوکھا، چمکیلا،

البیلا، نرالا، سبز خمار کی رنگتوں میں رنگا ہوا سجیلا پرندہ تھا.. اُس کی سبز رنگت ایسی گھنی تھی جیسے برازیل کے بارشوں کے جنگلوں کے آپس میں گتھے ہوئے ذخیرے ہوتے ہیں... جیسے آبشاروں تلے جو چٹانیں ہزاروں برسوں سے بھیگ رہی ہوتی ہیں، اُن پر جمی کائی ہوتی ہے.. جیسے دھان کے کھیتوں کی نچڑتی ہریاول کے قالین بچھتے چلے جاتے ہوں اور اُن کی ہریاول میں سے ہریل طوطوں کے غول کے غول نمودار ہو کر سارے منظر کو اپنی سبز رنگت سے بھر دیں.. جیسے وہ بے انت سبز سمندر ہوں.. وہ ایسا انوکھا لاڈلا پرندہ تھا..

مُوسےٰ مسحور ہو گیا.. اُس کے نرالے سبز حسن کا اسیر ہو گیا، اُس پر تو نظر نہ ٹھہرتی تھی تو وہ نظریں چُرانے لگا، نگاہیں زمین پر بچھا کر چلنے لگا.. یُوں چلتا گیا جیسے اُس کا وجود نہ ہو اور اس کے باوجود اُس پرندے کے بدن کے روشن طاق میں سے پُھوٹتی شعاعیں اُسے ایک ایسے خمار سے بھرنے لگیں جو حلّاج کے لہو سے کشید کردہ شراب کا کرشمہ ہوتا ہے.. جس کے ہر قطرے میں ''انا الحق'' کے پکھیرو کُوکتے تھے..

''اگرچہ تمہاری پہچان اُس اذان میں پوشیدہ ہے جو پیدائش کے بعد میرے کانوں میں اتری لیکن.. کیا تمہیں بھی سچ کی تلاش ہے؟'' بیت

''تم پہچان تو گئے ہو کہ میں غار حرا کے شگافوں میں بسیرا کرنے والا وہ پرندہ ہوں جس کے کانوں میں ''اقراء'' کی صدا آئی تھی اور میں نے پڑھ لیا تھا.. مجھے سچ کی تلاش میں نکلنے کی کچھ حاجت نہ تھی کہ سچ اُن شگافوں میں سے داخل ہونے والے چاندنی کے اُن جزیروں میں تھا جو وہاں بچھتے تھے جہاں جہاں گانٹھوں بھری جُوتیوں میں پوشیدہ اُس کے پاؤں اُن پتھروں پر ثبت ہوتے تھے لیکن.. ہم سب پرندوں کو عطار نے ایک ڈور میں باندھ دیا ہے.. یُوں بھی ہم سب.. ایک باہم عقیدے کی مختلف صورتوں میں بندھے ہوئے ہیں.. کوہ طور، بیت اللحم اور حرا کی غار ایک ہی

بندھن کے تسلسل کے پرندے ہیں...اگرچہ ہم مختلف گیت گاتے ہیں پر اُس گیت کی دُھن ایک ہی ہے..''

''تو پھر تم سب کے درمیان وہ شراب کہاں سے آ گئی جو حلّاج کے لہو سے کشید کی گئی تھی..''

''اگر تم ان سب پرندوں اور ان میں وہ بُدھ پرندہ بھی شامل کر لو تو ان کے بدن سے صرف ایک ایک بوند لہو کی ٹپکا لو اور اُسے کشید کرو تو اُس مئے لالہ فام کے ہر قطرے پر ''انا الحق'' کی تختی نصب ہو گی..یہ وہی مئے لالہ فام ہے..جس کے ہر جُرعے میں قرۃ العین طاہرہ کے عشق کے پنچھی بسیرا کرتے ہیں...یہ شراب عشق کی مدہوش مستی کی..تب وجود میں آئی جب..جب کُو بہ کُو اور کوچہ بہ کوچہ بھٹکتی دیوانگی میں طاہرہ کو ایک اندھے کنویں میں دھکیل دیا گیا..ایک مُدت کسی کو علم نہ ہوا کہ وہ کونسا کنواں تھا جس میں اُس پاک رُوح کو گرایا گیا تھا..اُس کا گلا ایک ریشمی رومال سے گھونٹ کر کس اندھیاری گہرائی میں پھینک دیا گیا تھا اور پھر بہت زمانوں کے بعد ایک آشفتہ حال جنوں خیز مسافر کا وہاں سے گزر ہوا..اور کنویں کی گہرائی میں سے وہ اپنے بھائی کو پکارتی تھی.. حلّاج حلّاج ..وہ ابھی تک زندہ تھی، سانس لیتی تھی..اور اُس کنویں کے قریب سے گزرنے والا مسافر حلّاج تھا..

طاہرہ کے گلے میں ایک ریشمی رومال کا پھندا تھا، اُس کے نازک بدن پر عشق اور جذب کے اتنے گھاؤ تھے کہ اُن کا شمار ممکن نہ تھا..اُس کے تن بدن کا کوئی ایک حصہ ایسا نہ تھا جس پر تین انگلیاں جمائی جاتیں تو اُن کے نیچے کسی گھاؤ کا نشان نہ آتا..تو جب وہ گرائی گئی تھی تو ہر گھاؤ ایک ایسا طاق ہوا جس میں اُس کے شعروں کے چراغ جلتے تھے..

عالم غیب کا پرندہ چہک اٹھا،

بہاء کے بُلبل نے پر پھیلا دیئے ہیں،

مُرغ سحر نہایت جمال و جلال سے محوِ خرام ہو گیا ہے،

اور یوں وہ کنواں جو صدیوں سے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، جس کے پانی کب سے پاتال میں جذب ہو کر خشک ہو چکے تھے، ان طاقچوں میں جل اٹھنے والے چراغوں کے نور اندر نور کی کرشمہ سازیوں سے وہ خشک ہو چکے پانی پھر سے پاتال میں سے پُھوٹنے لگے، طاہرہ کے دریدہ بدن کو اپنی آبی آغوش میں سمیٹ کر اُسے جُھلانے لگے.. اُس کے ہر گھاؤ پر اپنے نم ہونٹ رکھ کر.. بوسے ثبت کر کے پھر سے اُسے یوں زندہ کر دیا کہ طاہرہ جاگ گئی اور پھر اُسی لمحے ایک ایسے خواب میں اتر گئی جس میں اُس کا محبوب بہاء اللہ اُس کا دولہا بنا بیٹھا تھا... جیسے سچل سرمست مرنے کے بعد بھی اپنے مزار پر سہرے باندھے دولہا بنا بیٹھا ہے.. اور یوں اس کنویں کے مٹکے میں سب جہانوں کی سب سے خمار آور شراب کشید ہوئی جو سرخ رنگ کی تھی..

۔ اساں اندر باہر لال ہے.. ساہنوں مُرشد نال پیار ہے..

ایسی شراب کی کشید نہ تو فرانس کے تہہ خانوں میں، نہ شیراز کے نیم تاریک حجروں میں اور نہ ہی پنجاب کے کسی گاؤں کے کیکر کی جڑوں میں سے کشید ہوتی ہے.. یہ بلھے شاہ کی.. پی شراب تے کھا کباب تے ہیٹھ بال ہڈاں دی اَگ.. شاہ حسین کی لال شراب شمس تبریز کے جذب اور حلاج کے کٹے ہوئے بازوؤں میں سے ٹپکتے خون سے اور ایک متروک شدہ کنویں کے پاتال میں سے ہی کشید ہوتی ہے.. جن کی تہہ میں کبھی یوسف، کبھی طاہرہ اور کبھی پُورن بھگت کو گرایا جاتا ہے..

یہ لاڈلا سبز پنکھ پکھیرو تو عجب بولیاں بولتا تھا... جن لوگوں پر دشنام ہوئی، کافر کافر کہا گیا انہیں بھی مومن مانتا تھا.. اُس لمحے مُوسلے کے دل میں ایک عجب سوال کی کونپل پُھوٹی جسے ایک خواہش کے پانی سینچتے تھے.. اس پرندے نے تو اُسے دیکھا ہوگا.. وہ کیسا دِکھتا تھا، کیسا دِکھتا تھا.. اور

سبز پرندے نے جان لیا کہ اُس کی آرزو کیا ہے، دنیا میں کوئی ایسا تو نہ ہوگا جو اُس کا کلمہ پڑھتا ہو اور کبھی نہ کبھی اُس کے بدن میں سے ایک پیاس ہُوک نہ اٹھی ہو کہ.. وہ کیسا دِکھتا تھا..

پرندے نے جان لیا "وہ اے مُوسئے ایسا دِکھتا تھا کہ اُس کی جانب دیکھا نہ جاتا تھا... وہ ایسا سوہنا اور شکل والا تھا.. اُس کی قامت غضب ڈھاتی تھی، جب چلتا تو یوں لگتا تھا جیسے اترائی پر اتر رہا ہو.. اُس کے بال لشکیلے اور گھنگھریالے تھے.. وہ ایسا محبوب تھا جس کے بالوں میں چھلّے ہی چھلّے تھے اور بے شک کُل جہاں سوہنا ہو جائے پھر بھی وہ جہان اُس کے اُن پاؤں کی خاک ہوتا تھا جن میں اُس کے ہاتھوں سے گانٹھی ہوئی جُوتیاں تھیں... اگر چہ وہ آگاہ نہ ہوتا تھا پر میں جب کبھی وہ قدرے غافل ہوتا اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگتا، جوتیوں کی گانٹھوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیتا اور اُس کی آنکھیں جادو بھریاں متوالی مدھ بھریاں تھیں.. دونوں بھنوؤں کی کمانیں جڑی ہوئی تھیں اور ان کمانوں سے نکلنے والے اُس کی دل کشی اور سوہنے پن کے تیکھے تیر نہ صرف کل جہان کے انسانوں کو بلکہ چرند پرند کو بھی گھائل یوں کرتے تھے کہ وہ اُس کے عشق میں مدہوش ہو جاتے تھے. صحرائے نجد کے غزال اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے منتظر رہتے تھے کہ وہ نگار آئے تو ہم اُسے اپنے دل اور جان پیش کریں.. وہ غار حرا میں داخل ہوتا تھا تو اُس کے کومل بدن کی خوشبو سے اُس کے سارے پتھر بھی مہکتے جاتے تھے.. حیا ایسی تھی کہ فرشتوں سے بھی پردہ کرے.. بدن بوسکی تھا، ملائم اور دہکتا ہوا.."

"تو نے اُسے دیکھا ہوا ہے..."

"ہاں.. میں نے دیکھا کہ ایک یتیم اور بے آسرا شخص، ایک سیاہ کمبل میں روپوش، قبیلے کا دھتکارا ہوا جبل نور کی کٹھن چڑھائی پر یوں چلا آتا تھا کہ بلندیاں سرنگوں ہوتی جاتی تھیں.. وہ ایک اندھیری شب تھی جب وہ پہلی بار غار میں داخل ہوا.. اس کے شگافوں میں سے بہت دور کعبہ کے سیاہ چوکور وجود کے گرد ابوجہل اور ابولہب چراغ روشن کرتے دکھائی دیتے تھے.. وہ داخل ہوا تو جیسے یہ وہ

تھا جس نے کہا تھا کہ اے روشنی ہو جا.. اور یہ اُس کے بدن سے پھوٹنے والی روشنی تھی جس نے کل جہان کو روشن کر دیا.. میرا قدیم مسکن غار حرا اُس کے وجود سے یوں دمکنے لگا جیسے لاکھوں دیئے جل اٹھے ہوں.. بلخ کے آتش کدوں میں جتنی بھی مقدس آگ ہزاروں برسوں سے روشن تھی، اُس کی روشنی ایران، طُوران سے سفر کرتی اُس غار میں چلی آئی اور اُس کے قدموں میں آ کر بجھ گئی.. مکہ، بابل، نینوا اور ہند کے جتنے بھی پتھر خدا تھے اُن کے چرنوں میں جتنے بھی دیئے روشن تھے، جتنے بھی چڑھاوے کے پُھولے تھے وہ سب اپنی لَو اور مہک سنبھالتے سفر کرتے چلے آئے اور اُس کے پاؤں میں بچھ گئے.. کچھ بجھ گئے کچھ بھڑک کر جل اٹھے.. کچھ اپنی خوشبو کھو بیٹھے اور کچھ کی مہک خمار آور ہو گئی.... بے شک کہیں کسی تاریخ یا سیرت میں میرا تذکرہ نہیں ہے پرائے مُوئے میں وہاں موجود تھا.. میں جو بے حساب زمانوں سے اُس غار کے اندھیروں میں اُس کے ایک شگاف میں چند تنکوں کا گھونسلا بنائے حیات کرتا تھا.. میری تو آنکھیں چندھیا گئیں اتنی کہ مجھ سے تو دیکھا نہ جاتا تھا..''

''تو کیا تم اُس کے رخصت ہونے پر پھر سے اندھیرے میں چلے گئے..''

''نہیں کہ.. اُس کے وجود سے پُھوٹنے والی نور روشنی نے اگر چراغاں کر دیا تو ہمیشہ کے لیے ابد تک کر دیا.. بے انت چراغوں میں سے کوئی ایک بھی بُجھنے والا نہ تھا.. کہ ہر چراغ راستہ دکھاتا تھا.. وہ جو بھٹکنے والے تھے اُن کے راستے منور کرتا تھا.. اور وہاں وہ جب غار سے اترا تو کیا میں اپنے شگاف میں ہی مقیم رہا؟.. میں تو اُس کے پاؤں سے بندھ گیا.. اُس کی ڈاچی قصویٰ کے پاؤں میں ایک جھانجھر ہو گیا، اگر تم غور کرنے والے ہوتے تو میرے پروں کی سرسراہٹ میں پوشیدہ ایک پائل کی چھن چھن سُن لیتے... میرے دونوں پنجوں میں اُس کے عشق کی جس کی آنکھیں سیاہ جادو بھریاں ہیں، جھانجھریں بندھی ہیں.... میں جب اڑان کرتا ہوں تو سب آسمان میری جھانجھروں کی چھم چھم

سے کھنکتے جاتے ہیں..''

''اگر تم پر آخری سچ کا انکشاف ہو چکا تو اب کاہے کو کسی اور نئے سچ کی تلاش میں اڑانیں کرتے پھرتے ہو؟''

''سچ نیا یا پرانا نہیں ہوتا البتہ زمانے کے ساتھ ساتھ اُس کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں...وہ جو آسمانی احکام تھے کب کے طاقچوں میں دھرے تھے اُن پر کائی نمودار ہو رہی تھی..بدھ کے مجسمے شکست و ریخت کا شکار ہو رہے تھے..کوہ طور کی آگ سرد ہو گئی تھی...وہ بڑھئی جس صلیب پر نصب کر دیا گیا تھا اُس کی لکڑی کو گھن لگ گئی تھی اور کوئی بھی ''اقرا'' کی صدا پر دھیان نہ کرتا تھا جیسے سلیمان رخصت ہوئے تو کسی کو خبر نہ ہوئی اور جب جس عصا سے ٹیک لگائے ہوئے تھے اُسے گھن کھا گئی اور وہ مسمار ہوا تب سلیمان کی رخصتی کی خبر ہوئی..کرشن کی بانسری چُپ ہو چکی تھی تو اُن مجسموں کو پھر سے قابل پرستش بنانے کے لیے، اُس سرد ہو چکی جھاڑی کو پھر سے سُلگانے کی خاطر، اُس صلیب کو پھر سے ایستادہ کرنے کے لیے، اُس بانسری کی دُھنوں کو پھر سے بیدار کرنے کے لیے اور اقرا کی صدا کو دوبارہ کُل جہانوں میں گونجنے کے لیے..ہم سب عطار کے پرندے ہو گئے..ہم نے ایک لائی لگ مومن کی بجائے کھوجی کافر ہونا پسند کر لیا ہے..''

وہ من موہنا ہریل پرندہ بھی پھر سے اڑان کر گیا..پر اس سارے میں اُس کی جھانجھروں کی چھنک چھم چھم کرتی آخری آسمان تک جاتی اُس پر دستک دیتی رہی..

■•◆•◆•◆•■

دوپہر سر پر آ گئی تھی..

دُھند سویر کی تحلیل ہو چکی تھی..

جھاڑیوں کے نوکدار پتّوں پر اوس کی سب بوندیں دُھوپ کی شدت سے بخارات میں بدل کر آسمانوں میں حلول کر چکی تھیں..

یہ میں نے کیسی مسافت اختیار کر لی ہے جس کا کوئی انت نہیں، کوئی منزل نہیں.. مجھ سے اب چڑھائی کی یہ تپسیا نہیں ہوتی، مجھے پسپائی اختیار کر کے لوٹ جانا چاہیے..

میں ایک ہذیان اور فریب میں مبتلا ہوں..

نہ بھاگا جائے ہے مُجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مُجھ سے..

مُوسٰے حسین کا کوئی حال نہ تھا.. اُس کی ہڈیوں کا گُودا خشک ہوتا تھا، آنتوں اور شریانوں میں تھکاوٹ کی کشتیاں ڈوب ڈوب جاتی تھیں، مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی اُنہیں یوں سیراب کرتیں کہ سب سامنے کے منظر سرابوں کی مانند جھلملاتے تھے.. وہ پہاڑی سفر جو حقیقت کے سنگلاخ پتھروں سے شروع ہوا تھا، ہر قدم پر ایک خواب میں ڈھلتا جاتا تھا.. جو کچھ اُس پر بیت رہی تھی اُس میں حقیقت کے پرتو تو نہ تھے خواب کے مبہم سائے تھے.. اُس پونی ٹیل لڑکی نے بھی تو کہا تھا کہ کونسے پرندے، آسمان تو شفاف ہے.. وہ کسی حد تک مفاہمت تو کر چکا تھا کہ جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے.. کسی خواب میں گزر رہی ہے.. پرندوں کی اڑانیں اور گڈریئے کی بھیڑیں سب

کے سب ناموجود سے اگر موجود میں داخل ہوئے تو ایک خواب میں داخل ہوئے لیکن اُس کا بدن ایک اور ہول سے دوچار ہوا، اُسے باقاعدہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اُس خواب میں سے سفر کرتا اب ایک اور خواب میں داخل ہو رہا ہے..وہ ایک خواب در خواب حیات کے جہان میں اتر چکا ہے اور اس کے نیم خوابیدہ شعور کے نہاں خانوں میں ایک خبردار کرنے والی گونج جنم لیتی تھی کہ اگر تم اس دوسرے خواب میں جاگ گئے تو موت کے اندھیروں میں جذب ہو جاؤ گے، تمہیں فوری طور پر اپنے پہلے خواب میں لوٹنا ہوگا اور تم اُس میں جاگے تو زندگی سے رابطہ ہوگا..

اس خواب در خواب کشمکش کی غیر حقیقی سرابوں سے بھری دنیا میں بھی اُس کی سوچ کے پرندے مکمل طور پر مدہوش نہ ہوئے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ سب پرندے جو اُس سے ہم کلام ہوئے تھے وہ سب کے سب بھی تو اپنے اولین خواب سے ناآسودہ، نامکمل ہونے کی وحشت میں ایک اور خواب میں اتر گئے تھے..ورنہ اُن کے خوابوں کی تعبیر تو کب کی آسمانوں سے اتر چکی تھی اور اس کے باوجود ایک اور سچ کے متلاشی، اپنے گھونسلے، عقیدے اور جنتیں چھوڑ کر اپنے اپنے گناہ اور ثواب بھول کر یہاں تک کہ اپنے اپنے فرشتے بھی ترک کر کے وہ ایک اور خواب میں داخل ہو گئے تھے...اگر آخری سچ اُن کے پہلے خواب میں ہی اُن پر آشکار ہو جاتا تو وہ کاہے کو ایک اور خواب میں داخل ہوتے جس میں جاگ جانے سے جان جاتی تھی..

مُوئے حسین ایک ایسے بلیک ہول میں داخل ہو چکا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی، وہ بے اختیار تھا، جیسے تُند شور کرتی برفانی ندی میں بہتا ایک تنکا جو واپس نہ جا سکتا تھا، اُسے بہتے جانا تھا بلیک ہول کے اختتام پر ایک اور کائنات کے وجود میں داخل ہو جانا تھا..

سورج کے بھڑکتے چراغ کی بھسم کرتی روشنی مدھم نہ ہوتی تھی، اُس کی پوروں سے پسینے

کے جھرنے بہتے تھے جب اُس نے دیکھا کہ ٹلّہ جوگیاں کے گہرے نشیب میں سے ایک شخص، آس پاس سے بے خبر، اپنے جذب میں گُم نہایت آسانی سے چڑھتا چلا آ رہا ہے.. اُس کے سیاہ گیسو کاندھوں پر بکھرتے تھے، آنکھوں میں کاجل کی سیاہی رات ہوتی تھی اور اُن میں شاعری اور جوگ کے دیئے روشن ہوتے تھے.. اپنے گیروے پیراہن میں ایک شہزادے کی شانداری اور تمکنت سے وہ ٹلّے کے پتھروں پر پاؤں دھرتا اوپر آ رہا تھا.. وہ ذرا قریب ہوا تو مُوسے نے دیکھا کہ وہ کسی شناسا بستی کا باسی نہ تھا، دور دریسوں کی دُھول سے اُس کا پُروقار چہرہ اٹا ہوا تھا اور کاجل بھری آنکھوں میں طویل مسافتوں کی کوئلیں کُوکتی تھیں..

مُوسے کو اپنے سامنے پا کر نہ تو وہ ٹھٹکا نہ حیران ہوا جیسے وہ کوئی سنگِ میل تھا جسے وہاں ہونا ہی تھا، اُس کی کاجل سے سیاہ ہوتی آنکھیں اُس کی مرجھائی آنکھوں پر مرتکز ہوئیں اور اُس نے پوچھا "کیا یہی راستہ ہے جو مجھے چوٹی تک لے جائے گا؟" اور یہ پوچھتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ اُس کی موجودگی سے بے خبر ہے.. اُس نے یہ سوال جیسے جھاڑیوں، ہواؤں اور راستے کے پتھروں سے کیا ہو.. اگرچہ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا تھا پر یوں جیسے وہ کسی مجسّمے کی آنکھوں کو دیکھتا ہو... مُوسے کو اُس کی یہ بے اعتنائی ناگوار گزری اور اُس نے جواب میں خاموشی اختیار کی.. ایک طویل چُپ اُن کے درمیان دیر تک حائل رہی اور پھر مُوسے کو جیسے اُس پر ترس آ گیا ہو اُس نے اپنے آپ پر لاگو کردہ خاموشی ترک کر دی اور اُس نے بھی بے اعتنائی سے کہا "میں بھی گمشدہ ہو رہا ہوں.. نہیں جانتا کہ یہ راستہ ٹلّے کی چوٹی تک جاتا ہے یا مجھے کہیں اور لے جاتا ہے.. شاید وہاں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں.. کون ہو؟"

وہ گیسو دراز شاہانہ شباہت اور کجلے بھری سیاہ آنکھوں والا جواب دیئے بغیر اپنا جوگی لبادہ جھٹک کر جانے کو تھا کہ مُوسے نے اُس کا دامن تھام لیا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو.. تمہاری

شکل شباہت دیکھی بھالی لگتی ہے، کہیں نہ کہیں کسی مخطوطے میں تمہاری پہچان رقم ہے.. میری یادداشت کی راکھ میں جو ایک چنگاری پہچان کی کبھی مدھم ہوتی ہے اور کبھی سلگتی ہے اُسے اپنے تعارف کی پھونک سے بھڑکا دو.. میں جاننا چاہتا ہوں..''

''میرا دامن چھوڑ دو.. آج تک کسی شخص نے میرا دامن نہیں پکڑا.. مجھے عادت نہیں ہے، میں کون ہوں، اپنا تعارف کروانا بھی میرے لیے ایک رسوائی ہے.. اگر تم بہت بے خبر ہو تو میں وہ ہوں جسے مولانا روم نے نوا پردازِ ہندی، نکتہ آرا اور نوائے ارجمند رکھنے والا بادشاہ قرار دیا تھا کہ جس کے فقر میں ایک مقامِ بلند ہے.. اور میں خود جم ہوں اور میرے شعر جامِ جم ہیں..

زیرِ لب خندید پیرِ پاک زاد گفت اے جادوگر ہندی نژاد
آں نوا پردازِ ہندی رانگر شبنم از فیضِ نگاہ او گہر
کارگاہِ زندگی را محرم است
او جم است و شعرِ او جامِ جم است

مجھے اب بھی نہیں جانتے، نہیں پہچانتے تو گویا تم دانائے راز اور صوفیا کے امام رُومی سے بھی آگاہ نہیں ہو.. میں ہری بھرتری ہوں مہاراجہ چندرسین کا وہ بیٹا جس نے تخت اور تاج ترک کر کے فقیری اختیار کی.. تمہارے آج کے پونے دو ہزار برس پیشتر میں.... میں پیدا ہوا تھا.. تم عجب بے خبر ہو کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے درمیان ایک شخص اقبال نام کا تھا جسے تم نے قوالوں، سیاستدانوں اور پروہتوں کے سپرد کر دیا.. اُس کی قدر نہ کی، یہ وہ تھا جو افلاک کی خبر رکھتا تھا، گئے زمانوں کو پھر سے اپنی شاعری کے معجزے سے زندہ کرتا تھا.. آسمانوں کی سیر کے دوران ہم دونوں کی

ملاقات ہوئی اور اُس نے میری تعظیم میں ایک محفل سجائی، اپنے آپ کو زندہ رود کے طور پر پیش کیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ.. شعر سوزِ خودی سے جنم لیتا ہے یا خدائی عمل سے..

شعر را سوز از کجا آید بگوے　　　از خودی یا از خدا آید بگوے

اور میں نے کہا تھا کہ..

آں دلِ گرمے کہ دارد در کنار　　　پیشِ یزداں ہم نمی گیرد قرار

...... باد و بیتے در جہانِ سنگ و خشت　　　می تواں بردن سلِ حور از بہشت

میں وہی ہری بھرتری ہوں.. شاعر اور کچھ کے لیے ایک فلسفی.. واکیا پاڈیا سنسکرت گرائمر کی گرہیں کھولنے والا.. تم اگر مجھ سے واقف نہیں ہو تو میں تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا کہ تم نے اپنی ہزاروں برسوں کی ثقافت اور شاعری سے راہ فرار اختیار کر لی.. شیراز اور بغداد کے مسافر ہو گئے اور اپنا رستہ بھول گئے.. تم کہاں آگاہ ہو گے کہ میری شاعری کے مجموعے کا نام ''ساتا کاتری'' تھا..

''ایک ثروت مند شخص، ایک شاہی خاندان میں پیدا ہونے والا، دانش مند، خوش شکل.. اُس کی یہ سب خوبیاں سونے کی دمک کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں..''

''ایک شخص کے بھڑکتے ہوئے شعلے ایک عورت کی سیاہ آنکھوں میں روپوش سیاہ بادلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں..''

اور میرے ایک شعر کو تمہارے دانائے راز نے اپنی زبان میں منتقل کیا..

؎ پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

''اے چندر سین کے بیٹے بھرتری ہری..صرف ایک سوال ہے..آخر تو اپنی شہزادگی سے مُنہ موڑ کر ادھر پوٹھوہار کے اونچے نیچے ٹیلوں میں ابھرنے والی شیر پہاڑی کی بلندیوں میں کیوں بھٹک رہا ہے..''

بھرتری بولا...

؎ چرخہ از تست وہم آں رشتہ کہ بردوکِ تو رشت

تو خود ہی چرخہ ہے، خود ہی دھاگا ہے اور خود ہی تکلے کی نوک ہے..

''اے وہ جس نے اپنے چھوٹے بھائی وکرماجیت کی خاطر راج پاٹ چھوڑا۔ تُو مجھے حیرت میں مبتلا کرتا ہے کہ اگر تو نے چرخے کو اپنے شعر میں برتا تو کیا تیری راجدھانی میں بھی اُن گئے زمانوں میں بھی میرے پنجاب کے دیہات کی مانند چرخہ کاتا جاتا تھا..ابھی کل کا قصّہ ہے جب میری دادی اپنی سکھیوں کی سنگت میں اپنے کچے گھروندے میں، سرما کی بیت بھری راتوں میں چرخہ کاتی تھی..''ترنجن'' کی رات میں کوئی درجن بھر چرخے اور سب کے سب رنگ رنگیلڑے تازہ پوتے گئے فرش پر کہ جس میں سے تُوڑی کے سُنہری چھلکے جابجا ظاہر ہوتے تھے، یوں سجا دیئے جاتے تھے کہ ہر چرخے کی ہتھی گھماتی مُٹیار کی ہتھیلی میں رچی مہندی کی سجاوٹیں اور بناوٹیں اُس ہتھی میں سرایت کرتی چرخے کے گھماؤ کے اندر جذب ہو جاتی تھیں اور تب اُس چرخے میں سے ایک گُھوک کی صدا، نارسائی اور دکھ کی یُوں جنم لیتی تھی کہ اسے سُن کر جوگی پہاڑوں سے اتر آتے تھے..اگر تو صرف ایک ہی چرخے کی گُھوک جنم لیتی تو شاید وہ کوٹھڑی میں کاتنے والی مُٹیاروں کے انگار بدنوں میں ہی سلگ کر راکھ ہو جاتی پر وہاں تو درجن بھر چرخے گُھوک کی پُکار کرتے تھے..اُن کی ہتھیاں گھمائی جاتیں تو کائناتیں گردش میں آنے لگتیں..گُھوم چرخڑا گُھوم تیری کتن والی جیوے..گویا چرخے کی ہتھی گُھومتی تو اُس کے وجود پر الیکے ہوئے گُل بوٹے اُس گھماوٹ کی زد میں آ کر گُھومتے اپنی

شناخت کھو کر مدھم سے مدھم ہوتے جاتے یہاں تک کہ ایک شائبہ رنگوں کا گھومتا ہوا آنکھوں کے سامنے منظر ہو جاتا..

بھرتری ہری کوئی مافوق الفطرت داستانوی کردار تو نہ تھا کہ ٹلّہ جوگیاں کی چڑھائی پر وہ بے آواز سرکتا جاتا، وہ بھی تھکاوٹ کا شکار ہو رہا تھا.. اُس کا بدن اگرچہ ایک راج کمار کا بدن تھا لیکن ایک ایسے شاعر کا بھی تو تھا جسے اقبال نے افلاک کی سیر کے دوران بہشت کے گلزاروں میں دیکھا اور اُس کی شعری عظمت کا گرویدہ ہوا تو وہ بھی پسینے سے شرابور اپنا لبادہ سمیٹتا ہوا سانس درست کرنے کی خاطر ایک پتھر پر بیٹھ گیا..

''ہاں میرے اور تمہارے زمانے ایک چرخے کی گُھوک کی میٹھی مدھر تان سے جُڑے ہوئے ہیں.. میری دادی راج کماری بھی بن ٹھن کر، سونے کے گہنوں سے لدی، بھاری منقش لبادوں سے سجی اپنی داسیوں کے ہمراہ کہر آلود سفید راتوں میں راج محل کے ٹھٹھرتے فرش پر بچھے قالینوں پر بیٹھ کر چرخہ کاتا کرتی تھی.. میں ایک ننھا بالک اُس کے پہلو میں بیٹھا جب وہ تکلے سے لپٹے دھاگے کی پُونی کو اپنی انگوٹھیوں بھری اُنگلیوں میں دبوچ کر ہولے ہولے فضا میں بُلند کرتی تھی تو میرا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ ابھی یہ تند ٹوٹ جائے گی پر وہ نہ ٹوٹتی اور دھاگا آہنی تکلے کے گرد لپٹتا جاتا.. اور وہ تکلے سے اتاری ہوئی سُوت کی کاتی ہوئی اَٹیاں سونے کے تاروں سے مزین ایک ٹوکری میں رکھ کر اُسے میرے سامنے رکھ کر کہتی ''میرے پُتّر کے پُتّر تو ان اَٹیوں سے کھیل، ان کے دھاگوں کو اُلجھا کر انہیں خراب کر دے تاکہ میں ان اُلجھی ہوئی اَٹیوں کو پوری راجدھانی میں لیے پھروں کہ لوگو دیکھو انہیں میرے پوترے نے کھیل کھیل کر الجھا دیا ہے..'' پر میں ایک بُدھو بالک ہوا کرتا تھا، ٹوکری کی جانب ہاتھ ہی نہ بڑھاتا.. اور میری دادی راجکماری کی اچھیا اُس کے دل میں ہی رہ جاتی.. جان لے کہ سچ کا چرخہ انت سے ایک ہی ہے.. اُس کی گُھوک اور کاتا جانا والا سُوت میری

تمہاری دادی کے ہاتھوں میں سے جنم لینے والا سُوت کا دھاگا ایک ہی ہے جس میں ہم دونوں زمانوں سے ماورا بندھے ہوئے ہیں... اور ہاں مجھے یاد آتا ہے کہ جب کبھی میری دادی کے چرخے کا تکلا ذرا بے احتیاطی سے ٹیڑھا ہو جاتا تھا تو وہ اُسے سیدھا کروانے کے لیے راجدھانی کے ایک رشی آہن گر کے پاس لے جاتی تھی جس کا نام میں بھولتا ہوں..

''بھرتری.. وہ عبداللہ آہن گر تھا..''

''تو کیسے میرے زمانوں کے ایک رشی آہن گر کا نام جانتا ہے، مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ اُس کی کوٹھڑی میں ہمیشہ ایک الاؤ بھڑکتا رہتا تھا جس کے اندر وہ لوہا جھونکتا تھا یہاں تک کہ وہ پگھلنے لگتا تھا اور وہ اپنے ہتھوڑے کی ضرب سے اُسے عجب عجب شکلوں میں ڈھالتا تھا یوں کہ ہر شکل میں کبھی بُدھ اور کبھی برہما کی صورتیں متشکل ہونے لگتی تھیں..''

''وہ میرے شہر لاہور کا ہی عبداللہ نام کا آہن گر تھا... ایک ہندو عورت نہایت شکل والی جو جدھر سے گزرتی رُکھوں میں چہکتے پکھیرو اُس کے حسن کی آتش کی تاب نہ لا کر سلگتے ہوئے زمین پر گر کر اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتے.. وہ تمہاری دادی تھی ہری بھرتری.. اُس کا تکلا بھی ٹیڑھا ہو گیا تو وہ عبداللہ کے پاس آئی کہ اے آہن گر اگرچہ ٹیڑھے تکلے سیدھے کرنا تیرا کام نہیں پر مجھے نہیں معلوم کہ میں کس کے ہاں اپنا ٹیڑھا ہو چکا تکلا لے کر جاؤں... میرا یہ کام کر دے.. میرا رنگ رنگیلوا چرخہ آج ایک زمانے کے بعد چُپ پڑا ہے اور میں ایک کاتنے والی ہوں اور ایک زمانے کے بعد میری اُنگلیوں میں سے سرکتا دھاگا تکلے کے گرد نہیں لپٹ رہا تو میرا یہ کام کر دے.. میرا تکلا سیدھا کر دے..''

عبداللہ آہن گر نے اپنی بھڑکتی ہوئی بھٹی میں اُس عورت کا جو کہ تمہاری دادی تھی، ٹیڑھا ہو چکا تکلا جھونکا.. جو پل دو پل میں سرخ آگ ہو گیا. عبداللہ غافل ہو گیا، بھول گیا کہ تکلا کب کا آگ

ہو چکا ہے، اُسے بھٹی میں سے نکالنا بھول گیا، ٹکٹکی باندھ کر، آنکھیں جھپکتا نہ تھا وہ اُس عورت کے چہرے کی دلکشی سے مبہوت اُسے تکتا رہا اور جب ایک زمانہ بیت گیا تو اُس عورت نے اپنے چہرے کی دلکشی کی کمان میں سے نفرت اور طعن کے تیروں کا ایک وار کر کے کہا ''تیرا تو بڑا چرچا تھا کہ تُو ایک درویش ہے.. دنیا کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور تُو مجھے دیکھے چلا جا رہا ہے.. ایسا سنت سادھو ہے..''

تب عبداللہ نے بھٹی میں سے وہ آگ ہوتا تکلا نکالا اور کہا ''اے عورت میں اس سلگتے ہوئے تکلے کو اپنی آنکھوں میں ایک سُرمچو کی مانند پھیرتا ہوں.. اگر ان آنکھوں میں تیرے لیے حرص اور ہوس کا ایک بھی ڈورا تھا تو میں اندھا ہو جاؤں.. میں تو تیری موہنی شکل میں اپنے رب کا دیدار کرتا تھا..''

عبداللہ نے سلگتا ہوا تکلا اپنی آنکھوں میں پھیرا تو تکلا سرد ہو کر سونے کا ہو گیا.. اُس عورت نے اپنا گھر بار ترک کیا اور ہمیشہ کے لیے اُس کے چرنوں کی داسی ہو گئی.. ''بھرتری، میں خود وہاں گیا ہوں، لاہور کی میکلوڈ روڈ میں سے ایک گلی نکلتی ہے وہاں عبداللہ آہن گر کی قبر کے قریب ایک تہہ خانے میں تمہاری دادی دفن ہے اور میں نے کچھ پھول اُس کی قبر پر چڑھائے تھے، وہ جلی نہ تھی، اپنے مرشد کے قدموں تلے روپوش ہوئی تھی..''

ہری بھرتری کے ماتھے پر سے حیرت کے پسینے کی ایک بُوند اس کی بائیں آنکھ میں گری تو اُس میں لگا کاجل بہہ نکلا.. اُس کے رخساروں پر بہنے لگا..

''تو ہم بندھے ہوئے ہیں..''

''ہاں.. میری اور تمہاری دادی ایک ہی چرخہ کاتتی تھیں..''

وہ دونوں تادیر چپ رہے.. اور پھر مُوسے حسین نے خاموشی کا یہ قفل توڑا اور کہا ''بھرتری

تُو نے تو اسے دیکھا ہوگا..عرش بریں پر اقبال تیرے سامنے آیا اور وہ تیرا مداح تھا..تو نے اسے کیسا پایا..''

''وہ ایک مہان آتما تھی..میں نے اسے روبرو پایا تو گنگ ہوگیا..مولانا رُوم کا چہیتا مُرید جس کی شکتی اور گیان دھیان ایک دیوتا سمان تھی..جیسے میرا بائی نے اپنے کرشن کے گیت گائے وہ اپنے صحرائی کرشن کے وجدان بھرے نغموں میں مست تھا..وہ بڑا اپدیشک تھا من باتوں میں موہ لیتا تھا..اُس نے فنا کے پانیوں میں سے میری راکھ کشید کی، اُسے ذرہ ذرہ جوڑ کر اپنے شعروں میں پرو کے ابن مریم کی مانند پھر سے زندہ کر دیا..اگر اقبال نہ ہوتا تو میں دیگر ہزاروں راج کماروں اور شاعروں کی مانند گنگا کے پانیوں میں راکھ کی صورت بہہ چکا ہوتا..اور اُس نے مجھے اُن پانیوں سے کشید کر کے میری شاعری کے قلبوت میں زندگی کی پھونک بھر کے امر کر دیا..''

''لیکن اے ترکِ دنیا کر دینے والے راجکمار ابن مریم نے تو تیرے زمانوں کے بعد جنم لیا، تو اُس کی مسیحائی کو اپنے زمانے میں کیسے جان گیا؟''

''جان لے کہ جیسے سب چرخے مختلف زمانوں میں کاتتے جاتے ہیں لیکن وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ایک ہی دھاگے سے منسلک ہوتے ہیں، اُن کی گھُوک اُس دھاگے میں سرایت کر کے گزر چکے اور آنے والے زمانوں میں ایک ہی دُھنیے کے دھنک دھنک اِکتارے کی دُھن میں ہر دل کے اندر دھنکتی ہے تو ایسے ہی وہ جو گئے زمانوں میں اترے تھے اور جو آئندہ زمانوں میں اتارے جائیں گے یہ سب بھی ایک ہی دھاگے سے یوں بندھے ہوتے ہیں کہ اُس دھاگے کو کان کے قریب لاتے ہیں تو وہ سب جو کہا جا چکا ہے اور وہ سب جو کہا جائے گا اُس سے آگہی حاصل کرتے جاتے ہیں..''

''رخصت ہونے سے پیشتر ایک گتھی سلجھاتا جا..تیرے زمانوں کے بہت زمانوں بعد

ہمارے شاہ حسین، بلھے شاہ اور چل سرمست کے مست ذہنوں میں کیسے اُس چرخے کی گھوک گونجتی ہے جو تیرے شعروں میں گھوکتی ہے..

کر کتن وَل دھیان کُڑے

کت کُڑے نہ وتّ کُڑے، لاہ چھلّی، بھروٹے گھت کُڑے

چرخا میرا رنگڑا، رنگ لال...

''جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ سدا سے چرخہ ایک ہی ہے، اُس کے تکلے پر گھومتے دھاگے سب آپس میں منسلک ہیں، ایک تسلسل ہے، تاریخ اور زمانوں کے بہاؤ پر، بچھا چرخے کا تخت ایک ہے.. اُس چرخے کی گھمات میں شنکر اچاریہ بھی بولتا ہے کہ.. میں جسے تلاش کر رہا ہوں وہ میرے اندر پوشیدہ ہے.. دیکھو اجنبی میرا سفر کھوٹا ہو رہا ہے، سانس بحال ہو چکا، پسینہ خشک ہو گیا تو میں اپنی مسافت کو پھر سے جاری کرتا ہوں.. ٹلے کی چوٹی پر.. اگر میں پہنچ گیا اور اگر تم پہنچ گئے تو پھر سے میل ہو جائے گا۔''

''کیا اس میں کچھ شک ہے کہ ہم پہنچ پائیں گے یا نہیں؟''

''شک ہی تو تمام عقیدوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا سوال کرتا ہے.. اور یوں اعتراف بھی کرتا ہے اور اِنکار بھی.. عین ممکن ہے کہ ہم دونوں ایک لاحاصل کی جستجو میں ہوں..''

اُس نے اپنے گیروے لبادے کو سمیٹا، اپنی بکھری ہوئی لٹوں کو سنوارا، رخساروں پر بہنے والے کاجل کو پونچھا اور سانس سنبھالتا اُس سے آگے نکل گیا... کبھی اپنی راجدھانی کو واپس نہ آنے کے لیے.. ہری بھرتری نے ٹلہ جوگیاں پہنچ کر جوگ لیا، بقیہ عمر گیان دھیان اور شاعری میں بسر کی اور پھر جب وہ آخری سانس لے چکا تو ٹلے کے سینکڑوں جوگیوں نے اُسے سپردِ آتش کیا.. آج بھی نوا پردازِ ہندی، نوائے ارجمند ہری بھرتری کی سمادھی کے آثار ٹلہ جوگیاں پر تلاش کیے جا سکتے ہیں..

■•◆•◆•◆•■

مُوئے حسین کے کہولت زدہ گھٹنوں کے جوڑوں میں وہ گُودا خشک ہو چکا تھا جو اُن کے تحرک کی ضمانت تھا.. اُس کے جوڑوں کی ہڈیاں کڑکڑاتی ٹوٹنے کو آتی تھیں.. اُس نے ایک بار پھر لوٹ جانے کا قصد کیا تو اُس کے کانوں میں چرخے کی گُھوک نے سرگوشی کی.. لوٹ جانے والوں کے نصیب میں سچ کی بازیافت کبھی نہیں ہوتی، جو نہیں لوٹتے، گامزن رہتے ہیں، وہ کبھی نہ کبھی قاف کے پہاڑ پر پہنچ ہی جاتے ہیں، تو اُس نے پھر سے مسافت اختیار کر لی..

وہ بہت زمانے چلا.. کبھی وقت کی رفتار سے آگے نکل گیا اور کبھی وقت ٹھہر گیا، اُس کا انتظار کیا اور جب وہ گرتا پڑتا اُس تک آیا تو ٹھہرا ہوا وقت پھر سے رواں ہو گیا..

گھنی جھاڑیوں میں ایک سرسراہٹ سنائی دی، کوئی نہ کوئی تھا جو اُن کے گھنے پن میں الجھ گیا تھا، لاچار ہو کر پھڑ پھڑاتا تھا.. کوئی پرندہ تھا..

''کون؟''

اُدھر سے نہ کوئی کُوک آئی اور نہ کوئی چہکار سنائی دی، البتہ وہ جو سرسراہٹ سنائی دیتی جاتی تھی، ایسی کہ جیسے جھاڑیوں کی پوشیدگی میں کسی کی جان نکلتی ہو.. جھاڑیوں کے کانٹوں میں بوسیدہ چیتھڑوں کی مانند اُلجھی ہوئی ایک تڑپ تھی، جاں کنی کی سرسراہٹ تھی، دم نکلتا تھا.. اور تب پتوں کی اُس تاریک گپھا میں سے لہو کی ایک بوند ٹپکی، ایک سفید پر ڈولتا ہوا جھولتا آیا اور جہاں وہ بوند مٹی پر

گر کر جذب ہو رہی تھی، اُس پر ایک کفن کی مانند بچھ گیا..

یہ عجب عجائب کا کارخانہ تھا، یہ ٹلّہ، یہ ہاتھی کی شکل کا پہاڑ.. نظر کے دھوکے اور فریب ہر قدم پر... واہموں اور گمان کے عجب سمندر تھے جن میں عقائد کی مختلف بادبانی کشتیاں بھٹکتی پھرتی تھیں.. اُسے خوف آنے لگا تھا کہ ہر پتھر جو اُس کے قدموں تلے آتا تھا، کوئی نہ کوئی صنم ہوتا جاتا تھا، کسی نہ کسی عقیدے کا بنیادی پتھر ہوا جاتا تھا تو اُس نے اجتناب کیا، کھوج میں مبتلا نہ ہوا کہ آخر یہ ریند کہاں سے ٹپکی اور اس پر بچھا ہوا پَر کس کا ہے اور چلنے لگا.. چلا ہے تو جھاڑیوں کے بھیتر میں سے ہوں کا ایک الاؤ روشن ہونے لگا، ایک دل کو چیر دینے والی ہُوک سنائی دی..

"میرا سُندر سیاہ محبوب مجھے چھوڑ کر پردیس چلا گیا..

اُس نے کبھی کوئی سندیسہ بھی نہ بھیجا..

تو میں نے اپنے گہنے نوچ پھینکے..

اپنے سیاہ بال کاٹ کر پھینک دیئے

اور جوگ کا لبادہ پہن لیا..

چاروں اور اُسے ہی ڈھونڈتی پھرتی ہوں..

مُوئے حسین کے پاؤں میرا بائی کے کٹے ہوئے سیاہ بالوں سے بندھ گئے اور اُس نے جھک کر جہاں اُس نے پوچھا تھا کہ کون؟ وہاں چہرہ قریب کر کے پوچھا "تم میرا بائی ہو؟"

"اگرچہ میں اُس کے بھجن گاتی ہوں لیکن میں وہ نہیں کہ اُس کا کرشن کوئی اور ہے اور میرے کرشن کا نام بہاؤ اللہ ہے... ہم دونوں عشق کی ڈور میں بندھی سگی بہنیں ہیں.."

یہ تو خاتونِ عجم کی صدائیں تھیں جو اُس اندھے کنویں میں سے نکل کر ٹلہ جوگیاں کی فضاؤں میں بین کرتی پھرتی تھیں..

- اگر مجھے تیرے روبرو ہونے اور آمنے سامنے آنے کا موقع ملے..
تو میں تیرا غم،
نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو بیان کروں

- طاہرہ نے اپنی کتابِ دل کا ایک ایک صفحہ،
ایک ایک تہہ اور ایک ایک پردہ دیکھ لیا..
لیکن.. وہاں تیرے عشق کے بغیر کچھ بھی نہ پایا..

- ایک تُو ہے کہ تیرا مقدر سکندر اعظم کا سا ملک و جاہ ہے..
ایک میں ہوں کہ میرا نصیب درویشانہ رسم و راہ ہے..

اگر وہ اچھا ہے تو تجھے مبارک ہو
اور اگر یہ بُرا ہے تو میں اس کی حقدار ہوں..

- شِیر تُو ہے، شکر تو ہی ہے..
تو ہی شاخ ہے تو ہی ثمر ہے
تو ہی آفتاب ہے تو ہی چاند ہے
میں تو بس ایک ذرّہ ہوں، دُھول ہوں..

تو ہی کعبہ، تو ہی صنم ہے، تو ہی دیر تو ہی حرم ہے..
میں ایک گستاخ کنیز ہوں..
میں جب سے تجھ سے ملی ہوں بے حد اور بے انتہا ہو گئی ہوں..

جھکا ہوا مُوسے گویا ہوا، جس جھاڑی میں سے یہ صدا آتی تھیں وہ گویا کوہ طور کی جھاڑی تھی، وہ سجدہ ریز ہو جاتا اگر اُس کے گھٹنے اُس کا ساتھ دیتے کہ اُس جھاڑی اور اس جھاڑی میں سے عشق ہی تو کلام کر رہا تھا.. ''اے وہ جسے دانائے راز نے خاتونِ عجم کا لقب دیا، تو ہر اُس شخص کی آنکھوں کی ٹھنڈک جس کے سینے میں ڈاہڈی عشق آتش بھڑکتی ہے جو طاہرہ اور شفاف ہے.. دنیا بھر کے عشاق کے جذبات کی شدت کو اپنے شعروں میں بیان کرنے والی.. بے شک وہ اویس قرنی ہوں یا بلال حبشی، امام بوصیری ہوں، جنہوں نے قصیدہ بُردہ لکھ کر شفا پائی اور اُنہیں خواب میں وہ کمبل عطا کر دیا گیا جو قصوئی کے سوار کے بدن کو ڈھانپتا تھا.. ابو عبیدہ الجراح کے دانتوں کے درمیان ایک خلاء ہو.. رُومی، بلھے شاہ، سچل سرمست، منصور یا حلاج ہوں ان سب کی ترجمان تم ہو.. تم وہی ہو؟''

''میں وہ ہوں بھی اور نہیں بھی..''

''خاتونِ عجم.. قرۃ العین طاہرہ ہی تو ہو..''

''میں میرا بائی ہوں اور نہیں بھی.. ہم دونوں بہنیں ہیں.. ہم دونوں ایک ہی کوزہ گر کے عشق میں اُس کے چاک پر گردش کرتی ہیں جس نے ہمیں ڈھال کر ہمارے کچے بدن میں اپنی روح پھونک دی یوں کہ ہم بھی وہ کوزہ گر ہو گئیں.. کچھ فرق باقی نہ رہا.. تو من شدی، من تو شدی..''

''میں وہ ہوں جسے عشق سمندر کی لہروں نے ساحل کی ریت پر پھینکا اور میں تب سے ساحل کی ریت پر ایک مچھلی کی مانند تڑپتی ہوں، پھر سے اُس سمندر میں شامل ہو کر اپنا قطرہ وجود اُس میں کھو دینا چاہتی ہوں.. مسلسل جاں کنی کے عالم میں ہوں.. طاہرہ کی بہن ہوں.. اُس کی ماں جائی ہوں..''

مُوسےٰ حسین نے جھاڑیوں کی گھناوٹ کے پردے کو اپنے ہاتھوں سے سمیٹ کر چاک کیا تو وہاں ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا جاں کنی کے عالم میں تھا.. اُس نے اُس کے خون آلود بدن کو اپنی مٹھی میں بھر کر جھاڑیوں کے قفس سے آزاد کیا اور پھر سوال کیا کہ ''کون ہو.. اگر طاہرہ نہیں ہو تو..''

''میرا بائی ہوں.. وہ بھاؤ اللہ کی ڈور میں بندھ گئی، اُس کی ڈولی میں بیٹھ کر دُلہن ہو گئی اور میں کرشن کو دولہا بنا بیٹھی.. کیا تم مجھ سے واقف ہو کہ میں کون ہو.. میری پہچان رکھتے ہو؟''

''رتن ناتھ راٹھور راجپوت کی اکلوتی بیٹی جو کُرکی پر راج کرتا تھا. تُو نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو رادھا کے روپ میں ڈھال دیا.. زبردستی بھوج راج سے بیاہی گئی اور تیرا گھر والا مغلوں سے جنگ کرتا مارا گیا تھا..''

''ہاں تم میری پہچان والے ہو..'' زخمی پرندے نے اپنی خون آلود چونچ کھول کر کہا ''اور میں آج سے ساڑھے پانچ سو برس پیشتر دوارکا میں جلا دی گئی تھی..''

''تمہاری راکھ کہاں کہاں تک پہنچی.. میں نے اپنے کانوں سے طاہرہ کے عشق کے نغمے گلی گلی اور کوچہ کوچہ سُنے اسی لیے تو مجھے شائبہ ہوا تھا کہ اس جھاڑی میں سسکتا پرندہ طاہرہ ہے اور وہ تم تھیں، اس لیے کہ تمہاری راکھ دوارکا سے اڑی، ذرہ ذرہ راکھ کی تتلیوں کی مانند اڑی اور قزوین کی قربت میں اُس کاٹھ کباڑ سے بھرے کنویں کے پاتال میں اتری جہاں طاہرہ کا مردہ بدن ایک

چراغ کی مانند روشن تھا کہ عشق کبھی تاریک نہیں ہوتا.. یہ راکھ ذرہ ذرہ تتلیوں کی صورت طاہرہ کے بدن پر بیٹھتی گئی، اُس میں سرایت کرتی گئی یہاں تک کہ راکھ کی سب ذرہ تتلیاں طاہرہ کے دل میں اتر گئیں اور وہاں ابھی تک کون تھا وہی.. تو ہی کعبہ، تُو ہی صنم، تُو ہی دیر تو ہی حرم ہے.. اور یوں اگر کبھی طاہرہ میرے سامنے چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو ہو جائے تو مجھے گمان گزرے کہ وہ تم ہو..''

''وہ آپ کو ایک باغ میں لے گئے.. جلاد بہت دیر تک آپ کو مار ڈالنے کے حکم کو پورا کرنے سے تامل کرتے رہے اور آخرکار انکار کر دیا. تب وہ ایک حبشی غلام لائے جو نشہ میں چُور تھا.. اُس نے طاہرہ کے مُنہ میں رومال ٹھونس کر آپ کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا.. پھر انہوں نے آپ کے جسدِ اطہر کو باغ کے ایک اندھے کنویں میں پھینکا اوپر سے پتھر اور کوڑا کرکٹ پھینک کر اُسے بند کر دیا..''

''تذکرۃ الوفا''

''میری راکھ کہاں کہاں پہنچی میں تو آج تک اندھیرے میں رہی.. بے شک طاہرہ کا مقام عشق مجھ سے بھی بہت بلند ہے.. وہ بہاء اللہ کے ساتھ اور میں کرشن کے ساتھ بیاہی گئی، میں اُس کے کنول ایسے پاؤں کے ساتھ بندھ گئی اور وہ مجھے ڈولی میں ڈال کر لے گیا.. اور جب میں ایک سفید کفن میں لپٹی لکڑیوں کے ڈھیر پر پڑی تھی تو بھی اُسی ڈولی میں سوار ایک دُلہن تھی.. اور جب میں جل کر راکھ ہو گئی تو جلا تھا جسم جہاں وہاں دل تو نہ جلا.. اور اُس دل میں جو ایک ڈولی اتری تھی اُس میں سے ایک پکھیرو نے جنم لیا جو کرشن کے گیت گاتا چہکنے لگا.. میں ایک پکھیرو جس کے رنگ نیارے اور چھیل چھبیلے تھے اپنے کرشن کی تلاش میں نکلی تو راستے میں مجھے چار عطار کے پرندے ملے اور وہ

سب بھی اپنے اپنے سچ کی تلاش میں اڑانیں کرتے کسی قاف کے پہاڑ کی جانب چلے جاتے تھے، میں نے اُن کی ڈار میں شامل ہونا چاہا لیکن اُنہوں نے مجھے قبول نہ کیا.. میرا رنگ رُوپ اور اڑان کا ڈھنگ اُن سے جدا تھا.. اور جونہی ہم ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر اُترے.. انہوں نے مجھے اجنبی جان کر چونچیں مار مار کر نڈھال کر دیا..''

''وہ ایسے پرندے تو نہ تھے تو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''ان میں سے تین کا گٹھ جوڑ تھا، وہ تینوں ایک تسلسل میں آپس میں ایک ہی نسل، یکساں تہذیب، ملکوں، ثقافتوں اور کتابوں میں پروئے ہوئے تھے.. تم ہم میں سے نہیں ہو.. ہم دریائے نیل، دریائے اُردن اور زمزم کے پانیوں کے پالے ہوئے ہیں اور تمہارے وجود میں سندھ اور گنگا جمنا کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی ہیں.. بندرابن میں کُوکنے والے بُت پرست، گھنٹیاں بجانے والے کافر پرندے ہو.. ایک مکھن چور کو محبوب ماننے والے پتھروں کو پُوجنے والے بے راہرو پرندے ہو.. ایک اجنبی پرندے ہو.. دفع ہو جاؤ..''

اور تب میں نے اپنے زخم چاٹتے ہوئے فریاد کی کہ.. اجنبی تو تم ہو.. کوہ طور، یروشلم اور مدینے سے چلے آئے ہو.. میں نے کہاں دفع ہونا ہے کہ میرا بیج تو اسی دھرتی میں سے پُھوٹا ہے.. میں کہاں جاؤں.. تم تینوں کی شکلیں انیس بیس کے فرق سے ایک سی ہیں، میری شکل تم جیسی نہیں ہو سکتی تو تم جاؤ..''

اے مُوئے..اُن میں سے جو بزرگ پرندہ قدرے پُرتکبر تھا اور اُس کا تکبر اس لیے جنم لیتا تھا کہ وہ اس خیال کا اسیر تھا کہ بقیہ دونوں پرندوں نے اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کو اُسی سے مستعار لیا ہے، ذرا سی ادل بدل سے اپنی دکان الگ کھول لی ہے.. اُس بزرگ پرندے کی شکل تم سے ملتی جلتی تھی تو مجھے تم سے بھی ڈر لگتا ہے.. چنانچہ میرے بال و پر نوچ گئے، ٹھونگیں مار مار کر انہوں نے میری

کو ملتا کو لہولہان کر دیا اور میں ٹلہ جوگیاں سے اترا اور اس جھاڑی میں اپنا لہو چاٹنے اور اپنے نوچے ہوئے بال و پر کے دوبارہ اُگنے کے انتظار میں پناہ گزیں ہو گیا.. مجھے اُن سے ایک گلہ بہت ہے.. وہ سب سے پہلے جنم لینے والے بدھ پرندے کو کچھ نہیں کہتے، اُسے محض اس لیے قبول کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک اگر اس دھرتی پر ایک لاکھ بیس ہزار اوتار آئے اور دنیا کی ہر بستی میں اُنہی کی زبان بولتے آئے تو وہ فاقہ کش بدھ بھی اُن میں سے ایک ہو سکتا ہے، اُسے اوتار مانتے ہیں اور میرے کرشن سے انکاری ہوتے ہیں.. اُس کی تضحیک کرتے ہیں کہ وہ تو ایک مکھن چور لونڈا تھا، گوپیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا رہتا تھا.. میں کیوں جواب دوں کہ گوپیاں تو اوروں کی بھی تھیں..''

''اپنی چونچ بند رکھو..'' موسُے نے اُسے ڈانٹا اور پھر اُس کے زخموں پر بلھے شاہ کی مرہم کا پوچا پھیرا، شاہ حسین، بابا فرید اور سچل سرمست کے سرمدی پھاہے رکھے.. رومی کے جذب کے جزیرے اُس کے نوچے گئے بال و پر میں جذب کیے، میاں محمد کی شام کے دھندلکوں کے پانیوں سے اُس کے زخم دھوئے..

ے شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرناں

تو یہ کونسا شام ہے جس کے بنا ایک پانی بھرن آئی گوپی نے گھر جاتے ہوئے ڈرنا ہے.. یہ وہی رادھے شام ہے.. اور وہ کونسا شام ہے جسے بلھے شاہ چِٹّیاں لکھتا ہے..

چِٹّیاں لکھاں میں شام نُوں، مینوں پیا نظر آوے

اور کون ہے آئینوں میں بس تو ہی تو ہے..اور کون ہے جو گھونگھٹ میں چھپ گیا ہے..

اُس کا سکھ اِک جوت ہے، گھونگھٹ ہے سنسار
گھونگھٹ میں وہ چھپ گیا، مُکھ پر آنچل ڈال

ہندو نہیں، نہ مسلمان بہے ترنجن، تج ابھماں
سُنّی نہ، نہیں ہم شیعہ صلح کُل کا مارگ لیا

اُس کرشن پرندے کے سب کے سب زخم بھر گئے، خراشیں مندمل ہو گئیں اور ان مرہموں اور پھاہوں کی تاثیر سے اُس کے نوچے گئے بال و پر پھر سے ہرے بھرے ہو گئے اور وہ شادمانی میں چہکنے لگا۔''اس رُومی کے شمس کی دھوپ کی کرنیں میرے لیے ایک نئی زندگی کا پیام لے کر آ گئیں اور یہ جو شاہ حسین، بابا فرید، سچل سرمست، میاں محمد اور بلھے شاہ تمہارے اور ہمارے ہیں یہ اسی دھرتی کے جوہڑوں میں کھلنے والے ایسے کنول ہیں جن میں ہر کنول پر ایک بُدھ گیان میں براجمان ہے.. یہ سب تو کرشن کا ہی ایک اور رُوپ ہیں تو میں اب ان کے گیت بھی گاؤں گا..''

''کیا تم اب اڑان کے قابل ہو گئے ہو؟''

''ہاں، میں اڑا کہ اڑا..''

''کہاں جاؤ گے؟''

''میں نے تو کہیں ایران طوران نہیں جانا..یہیں اپنے بندرابن میں جاؤں گا..''

''دوبارہ ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر نہیں جاؤ گے؟''

''وہ مجھے قبول نہیں کرتے..پھر سے میرا گھیراؤ کر لیں گے، یہ غیر ملکی حملہ آور مجھے دوش دیتے ہیں کہ میں ایک اجنبی پرندہ ہوں، حالانکہ وہ ہیں..تو میں چلا..اڑا کہ اڑا..''

جونہی کرشن پرندے نے اڑان کے لیے پر کھولے، واپسی کی ٹھانی تو یکدم تیز ہواؤں کا شور ہوا، شرلاتی شور کرتی ایسی تند ہوائیں چوٹی سے اتریں کہ جھاڑیوں کی جڑیں اُن کی شدت سے اکھڑنے لگیں۔.کرشن پرندے کے کُھلے ہوئے پَر اُن کی تیز پھڑ پھڑاہٹ سے ڈولنے لگے۔.کوئی شور ایسا شور تھا، تیز ہوائیں ایسی تیز دھار تھیں کہ اگر کوئی تنکا اُن کے راستے میں آتا تو دو نیم ہو کر فضاؤں میں اڑنے لگتا اور ایک گونج تھی جس کے گنبد میں وہ چاروں پرندے سر جھکائے چلے آئے ''تم نے اے کرشن پرندے کہیں نہیں جانا۔.ہم سے بُھول ہوئی کہ ہم نے تمہاری کوملتا کی کنوارگی کو اپنی چونچوں سے ادھیڑ ڈالا۔.ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ تمہارے بغیر ہم ادھورے ہیں، جب تک تم ہماری ڈار میں شامل نہیں ہو جاتے ہم نامکمل ہیں۔.تمہارے اور اب ہمارے بھی کرشن کے بغیر سچ ادھورا ہے۔.اگر تم واپسی کا قصد کرو گے تو ہم بھی تمہارے ہمراہ اڑان کرتے بندرابن میں جا بسرام کریں گے۔.ہم جان گئے ہیں کہ سچ صرف قاف اور جوگی پہاڑ کی چوٹی پر ہی نہیں، بندرابن میں بھی اس کی کچھ چنگاریاں سلگتی ہیں...نہ جاؤ۔.''

کرشن پرندے کی آنکھوں سے نیر بہہ نکلے۔.میرا بائی کا دل بھر آیا۔.

ہے آنکھ وہ جو شام کا درشن کیا کرے
ہے سیش جو پربھو چرن میں وندن کیا کرے
بے کار وہ دکھ ہے جو رہے ویاتھ باتوں میں
مکھ وہ ہے جو ہری نام کا سمرن کیا کرے
ہیرا موتی سے نہیں سوبھا ہاتھ کی
ہے ہاتھ وہ جو بھگوان کا پوجن کیا کرے

ایسی لگی لگن، ہوگئی میں مگن

وہ جو گلی گلی ہری گنگنانے لگی

محلوں میں پلی بن کے جوگن چلی

میرا رانی دوانی کہانے لگی

کوئی روکے نہیں، کوئی ٹوکے نہیں

میرا، گووند گوپال گانے لگی

بیٹھی سنتوں کے سنگ، رنگی موہن کے رنگ

میرا، پریمی پریتم منانے لگی

■•◆•◆•◆•■

ابھی آنکھ جھپکی تو وہ پرندے موجود تھے، ساتوں غُل کرتے، چہلیں کرتے، کُوکتے کہ.. اُن کی صلح ہوگئی تھی اور ابھی.. وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے..

مُوسےٰ حسین نے ابھی آنکھ جھپکی تو پرندوں کی چہکار میں تھا اور ابھی یکدم اور یکسر تنہا ہوگیا تھا. تنہائی کے ہمراہ خاموشی کی لاکھوں بلیاں چلی آئیں.. اُن کی رنگت کیا تھی اس کا فیصلہ تبھی ہوسکتا ہے جب یہ طے ہو جائے کہ خاموشی کونسے رنگ کی ہوتی ہے.. اگر وہ ہمارے تصور میں ایک اندھیارے کی کیفیت میں ہے تو وہ بلّیاں سب کی سب سیاہ تھیں اور اگر خاموشی ایک دور افتادہ برفزار ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ سب کی سب سفید تھیں..

ایسی چپ خاموشی اتری کہ اگر کوئی تتلی بہ نوکِ خار رقص کرنے کی کوشش کرتی تو بھی چُپ کے پَر نہ کھولتی..

بہت زمانوں تک یہی سناٹا طاری رہا اور پھر یکدم ٹلّہ جوگیاں کا وہ آسمان جو شفاف شیشہ تھا، اُس میں ایک کڑک کی دراڑ نمودار ہوئی.. اور اُس کڑک سے سہم کر وہ سیاہ یا سفید بلیاں چپکے سے رخصت ہوتی گئیں.. جانے کہاں سے مست سیاہ ہاتھیوں کے بادل پَرے اُمڈے چلے آرہے تھے، موسم کا مزاج برہم ہوگیا.. گھنگھور گھٹاؤں میں سے کب سے ضبط شدہ آنسو کی مانند ایک موٹی بُوند گری..

وہ واحد بُوند تھی، وحدانیت کا پرچار کرتی وہ بُوند مُوسےٰ کے ماتھے پر گر کر بہتی ہوئی اُس کی

دائیں آنکھ میں سرایت کر گئی.. منظر دھندلانے لگا.. ہر شے، پتھر، پہاڑ، جھاڑیوں کے جھنڈ یہاں تک کہ اُن پر منڈلاتے باریک مچھر ایک آبی پردے کے پار سراب ہونے لگے.. اُس آنکھ میں پھیلی ہوئی واحد بوند کی آبی زبان پر ایک ورد جاری ہو گیا..

ایک اونکار خدا ہے واحد	سچا جس کا نام
کرتا دھرتا دنیا کا بے ڈر	بے لاگ مدام
موت سے بالا پاک جنم ہے	قائم اپنے آپ
اپنے گُر کی رحمت سے	تُو نام اُسی کا جاپ

وہ ایسے آرام اطمینان سے ہر پتھر پر قدم رکھتا چلا آ رہا تھا جیسے وہ پتھر اُسی کے پاؤں کے لیے تخلیق کر کے اُس کی راہ میں بچھایا گیا ہو.. اُس کی نور بھری نور شکل سے نظر نہ ہٹتی تھی، اُس کے چہرے پر پانچ دریاؤں کے پانیوں کا نکھار تھا اور وہ تو کوئی سچ کا سوداگر تھا.. ہمیشہ سچا سودا کرنے والا تھا..

سچا روزِ ازل سے پہلے	سچا روزِ ازل بھی وہ
سچا ہے وہ آج بھی نانک	سچا ہو گا کل بھی وہ

وہ تنہا نہ تھا..

اُس کے بائیں جانب بھائی مردانا اپنے رباب پر جھکا اُس کی تاروں کو چھیڑتا تو وہ تار

عبداللہ آہن گر کے تکلے کی مانند سلگنے لگتے، تپش میں آ کر طُور کی کسی جھاڑی کی مانند روشن ہونے لگتے.. مردانے کے رباب کی تاروں کو ذرا چھیڑنے سے اُن میں سے وحدانیت کے پنکھ پکھیروؤں کے الاپ جنم لینے لگتے.. اسی لیے تو سچا سودا کرنے والا وہ سوداگر کہتا تھا کہ.. جب مردانا اپنا رباب چھیڑتا ہے تو مجھ پر آسمانوں سے بشارتیں اترنے لگتی ہیں..

مُوسےٰ اس موسیقار میراثی کو جو سچ کے سوداگر کے بائیں جانب اپنے رباب پر دین دنیا سے غافل، تلّہ جوگیاں کے وجود سے غافل صرف اپنے سچے صاحب کی موجودگی سے آگاہ رباب کی تاروں میں گُم تھا.. مُوسےٰ اسے جانتا تھا.. اُسے نہیں اُس کی آل اولاد کے تسلسل کو جانتا تھا..

ابھی پچھلے برس وہ لاہور کے پرانے شہر کی ایک قدیم حویلی کے نیم تاریک تہہ خانے میں اترا تھا.. تہہ خانے میں اترتی سیڑھیوں پر صدیوں کی تہہ در تہہ دھول جمی ہوئی تھی، وہ کسی بھی سیڑھی پر پاؤں دھرتا تو دُھول کے ذرّے ریزہ ریزہ نیم تاریکی میں بلند ہو کر دمکنے لگتے.. اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس متروک شدہ تہہ خانے میں عُسرت اور بیماری کی زندگی بسر کرتا بھائی مردانے کی نسل کا آخری رباب نواز بھائی شمس الدین.. ربابی آخری سانس لے رہا ہے.. جونہی اُس نے تہہ خانے میں قدم رکھا تو اُس کی مخدوش چھت میں سے جدا ہو کر مٹّی کا ایک کوزہ گرا اور دھول میں گر کر ٹوٹ گیا.. وہ جھجک گیا.. اُس چھت کی بوسیدگی میں سے سینکڑوں عریاں ہو چکے مٹّی کے کُوزے پہلو بہ پہلو مُنہ کھولے معلّق تھے.. قدیم لاہور کی حویلیوں کی چھتوں کو شدید گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کے دوران کُوزے اک دوجے کے ساتھ جوڑ کر اُن پر مٹّی کی ایک تہہ بچھا دی جاتی تھی اور یوں گرمی کی شدت اُن کوزوں میں جذب ہو کر مکینوں کو ایک ٹھنڈک کے احساس سے دوچار کرتی تھی..

ربابی بھائی شمس الدین تہہ خانے کے پہلو میں ایک گُھپ اندھیری کوٹھڑی میں ایک ایسی

چارپائی پر پڑا تھا جس کی ڈھیلی ہو چکی بُنت نے مدتوں سے دن کی روشنی نہ دیکھی تھی.. مُوسے نے اپنے موبائل کی روشنی آن کر کے شمس الدین کے چہرے پر مرکوز کی تو اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اُس نے خوفزدہ ہو کر پوچھا، کون ہے؟

''یہ میں ہوں بابا جی.. مُوسے حسین میرا نام ہے..''

''بابا کیوں آئے ہو؟''

''وحدانیت کے وہ گیت سننے جو آپ کے جدامجد کے رباب میں سے جنم لیتے تھے..''

''یہ ٹارچ کی روشنی بجھا دو..'' اُس نے اپنی آنکھوں کو ڈھانپتے ہوئے کہا..

مُوسے نے فوراً موبائل کی لائٹ گُل کر دی اور وہ جو وقفہ تھا جس کے دوران شمس الدین کا چہرہ تیز روشنی کی زد میں تھا اور وہ ابتدائی لمحہ جب وہ پھر سے تاریکی میں روپوش ہونے کو تھا مُوسے حسین ایک پل کے لیے ٹھٹک گیا کہ سفید ریش چہرے کی مشابہت بابا نانک کی شکل ایسی دکھائی دی تھی..

''میرے پاس رباب کہاں.. ہو گا اسی تہہ خانے میں کہیں.. اُسے تلاش کرنا بے سُود کہ اُس کی تاریں کب کی زنگ آلود ہو کر ٹوٹ چکی ہوں گی.. جیسے میرے سانسوں کی تاریں ٹوٹنے کو ہیں.. رباب کو توڑ دیا گیا تھا پاکستان بننے سے پہلے گورو کے ماننے والے میرے چرنوں میں آ کر بیٹھتے تھے اور جب میں اپنے رباب پر وہی اشلوک چھیڑتا تھا جو میری نسل کے سائیں بھائی مردانا گایا کرتے تھے تو وہ لوگ میرے چرنوں میں نہ صرف پُھول چڑھاتے تھے بلکہ ملکہ وکٹوریا کے سونے کے پاؤنڈوں کے سکّے بھی نذر کرتے تھے..

نیم تاریکی میں بھی شمس الدین کی مرتی ہوئی آنکھوں میں تیرتی نمی نظر آتی تھی.. اور میں رباب کی دُھن پر وہی گیت گاتا چلا جاتا تھا جو ان کے گورو پر آسمانوں سے اترے تھے..

سچا ہے وہ صاحب سچا سچا پیارا نام اُس کا

اونکار ست نام کرتا پُرکھ نر بھو نر دیر
اکال مُورتِ اجونی سے بھن گُر پرسادِ

پاکستان قائم ہونے کے بعد بھی سرحد پار سے کچھ لوگ کھوج کرتے مجھ تک آ جاتے اور میرے رزق روزگار کا سلسلہ چلتا رہتا لیکن اب تو جانے کیوں ہم ایک دوسرے کے ایسے بیری ہو گئے ہیں کہ ایک مدت سے نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا..اس ہندو حویلی پر جتنے بھی لوگ قابض ہیں اُن کی مہربانی ہے کہ مجھے یہاں پڑا رہنے دیتے ہیں، دو وقت کی روٹی دے جاتے ہیں، کبھی بُھول بھی جاتے ہیں..اور اُن کی نوجوان نسل کے کچھ لوگ تو مجھے مُرتد کہتے ہیں کہ میں بابا نانک کے گیت گایا کرتا تھا..انہوں نے ہی میرا رباب تار تار کر کے اسی تہہ خانے میں پھینک دیا ورنہ میں اُسے گلے سے لگا کر دم دیتا..

اے انسان تو دنیاوی عیش و آرام میں پھنس کر
اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بھول چکا ہے
اُس کی زندگی کرنے والے انسان کے سب کام سنور جاتے ہیں

مُوئے حسین نے اُس کے بٹوے میں جتنی رقم تھی وہ نکال کر اُس کے سرہانے رکھی اور کوٹھڑی سے باہر آ گیا...

تہہ خانے کی چھت سے ایک اور کُوزہ گرا لیکن حیرت انگیز طور پر کسی ایسے زاویئے پر گرا کہ ٹوٹا نہیں، سالم رہا مُوئے نے اُسے اٹھایا اور گھر لے آیا..وہ ابھی تک اُس کے سٹوڈیو میں جمع کاٹھ

کباڑ کے درمیان کہیں پڑا ہے، اُس نے صرف ایک بار ایک ''سِٹل لائف'' پینٹ کرنے کے لیے
ایک پُھول، ایک اجرک اور ایک سگرٹ کی ڈبیا کے برابر میں رکھا، ان حنوط شدہ اشیاء کو کینوس پر اتارا
اور پھر بُھول گیا، اُس قدیم حویلی کی چھت کی بوسیدگی میں سے جب آخری کوزہ گرا ہوگا تو وہ بھائی
مردانے کی نسل کے آخری ربابی کے سانسوں کی مانند ٹوٹ گیا ہوگا..

وہ دونوں.. اپنے اپنے رباب بجاتے کہ نانک بھی ایک رباب نواز تھا، پنجاب کے گاؤں
گاؤں بھٹکتے پھرتے وحدانیت کے گیت گاتے پھرتے تھے..

ایسے نانک ایسے جتنے بھی اُس کی ذات میں گُم قریہ قریہ گھومنے والے اُس کے صُوفی
بندے تھے وہ سب کے سب شاعر اور ماہر موسیقار تھے.. بلھے شاہ بھی اپنی کافیاں اپنے ساز کی سنگت
میں کوچہ کوچہ گاتا پھرتا تھا، یہ ساز ابھی تک اُس کے مدفن کے پہلو میں محفوظ ہے.. شاہ لطیف بھٹائی کی
ستار اُس کے مزار سے متصل ایک شوکیس میں دیکھ لو.. سچل سرمت بھی اپنا اِکتارہ لیے پھرتا تھا.. شاہ
حسین اور شہباز عثمان مروندی قلندر بھی اپنا کلام پڑھتے تھے تو اُن کے مرید سنگت کرتے تھے.. اور وہ
جو مردِ قلندر نانک تھا اُس کے گُن تو اقبال نے بھی گائے تھے..

برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بُت کدہ پھر بعد مُدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے..

مُوسے کہاں جانتا تھا کہ ایک معمولی ٹیلے کی چڑھائی کے دوران اُسے ایسے لوگ ملیں گے جو گزر چکے زمانوں میں گزر چکے تھے.. اُسے گمان یہی ہوا کہ وہ ایک خواب اندر خواب میں ہے اور اگر وہ اُس آخری خواب میں بیدار ہو گیا تو مر جائے گا تو وہ نہیں جاگا اُسی خواب میں مبتلا رہا اُس نُور والے درویش سے سوال کیا جو مردانے کے رباب کے تاروں کی دُھن پر وجد میں آتا اُس کی جانب چلا آتا تھا۔ ''باباجی.. آپ اپنے آبائی قصبے تلونڈی سے جدا ہوئے جو آپ کے نام کی نسبت سے نانک والا ننکانہ ہو گیا.. بہت دیس گھومے، نگر نگر کی خاک چھانی.. تو آج ادھر ٹلہ جوگیاں کی جانب کیوں رُخ کر لیا.. کیا ابھی تک سچے سودے کی تلاش میں ہو؟''

باباجی رُکے تو مُوسے نے دیکھا کہ اُن کے چہرے پر تھکاوٹ کے پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی، اتنی کٹھن چڑھائی کی مشقت کی ایک شکن نہ تھی.. پنجاب کے جوہڑوں میں کھلنے والے کمیوں کے پُھولوں کی مانند کھلا ہوا تھا.. اُن کے چہرے پر وہ رُوپ چڑھا ہوا تھا جسے نظر بھر کے دیکھنا محال ہو رہا تھا..

''میرے بھائی سُنو۔'' اُنہوں نے اپنی گھنی سفید لشکیلی داڑھی پر ہاتھ پھیرا ''یہ داڑھی ایک ایسا گھونسلا ہے جس میں تمام ایمانوں کے پنکھ پکھیرو امن آشتی سے قیام کرتے ہیں... یہ بیک وقت کرشن اور کالی کملی والے کے نُور اندر نُور سے نور ہی نور ہے.. ان دونوں پکھیروؤں کے گیت میں نے سب کے سب سچ مان کر جان کر ایک ہی گیت میں ڈھال دیئے ہیں.. کوئی بھی نیا عقیدہ پچھلے عقیدوں کی مکمل نفی نہیں کرتا بلکہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اُسی راستے کا مسافر ہو جاتا ہے جو ازل سے طے شدہ ہے اور ابد تک قائم رہے گا، میں نے بھی کوئی نیا دھرم ایجاد نہیں کیا، کرشن اور کملی والے کو ایک ہی مالا میں، نفرتیں اور کدورتیں ختم کر کے ان کو ایک ہی لڑی میں پرو کے اس سرزمین کو تعصب کے زہر سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے... میں نانک قینچی نہیں جو کاٹتی ہے، ایک سُوئی

ہوں جو جوڑتی ہے... بلھے شاہ کی مانند.. ہندو نہیں، نہ مسلمان.. ضلع کُل کا مارگ لیا.. اسی لیے جب میں اپنی خاکی اور عارضی موجودگی سے بظاہر ناموجودگی کے جہان میں منتقل ہوا تو مجھے جلایا بھی گیا اور دفنایا بھی گیا.. اور اگر تمہیں یہ بھارت پریشان کرتی ہے کہ میں آج ٹلّہ جوگیاں کی مسافت پر کیوں کمربستہ ہوں تو جان لو کہ سچ کی تلاش کا کوئی انت نہیں ہوتا.. میں بنارس گیا، گنگا کے پانیوں سے اشنان کیا.. مکّے گیا، زمزم کے پانی پیئے، اللہ کے گھر کے گرد پھیرے لگائے.. بغداد کے ایک قبرستان میں گیان دھیان کیا پر پھر بھی ایک خلش باقی رہی.. اس ٹلّے کے دامن میں چلہ کاٹا پھر بھی تشفی نہ ہوئی تو اب اس کی چوٹی کی جانب سفر کرتا ہوں.. وہاں پہنچ کر کچھ دن ٹھہروں گا.. کیا پتہ وہاں مجھ پر بھی اقرأ کا کوئی حکم نازل ہو... خلش کا مداوا ہو، تشفی ہو جائے.. کچھ سوالوں کے جواب وہاں مل جائیں.. پر تم کون ہو؟''

''مُوسے حسین..''

''تم وہی مُوسے ہو؟''

''نہیں.. میں وہ نہیں.. میں تو ایک معمولی سی نقش نگار ہوں.. بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوں..''

''جو بھٹکتے ہیں وہی نصیب والے ہوتے ہیں جنہیں بالآخر سچ کے راستے مل جاتے ہیں... میری طرف دیکھو میں بھی زندگی بھر بھٹکتا رہا اور آج میں اُس راستے پر آ نکلا جو میرا مطلوب تھا..''

اس دوران بھائی مردانا نے رباب بجانا موقوف کر دیا اور وہ مُوسے حسین کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اُس نے اپنے گورو سے مخاطب ہو کر کہا ''سچے صاحب.. سفر کھوٹا ہو رہا ہے..''

''سفر تو سب کے سب کھوٹے ہوتے ہیں مردانے.. آج تک جو لوگ بھی متلاشی ہوئے سچ کی جستجو میں اپنے پاؤں کو چھلنی کر کے اُن میں دیس دیس کی خاک چھانی تو کیا کبھی اُس چھلنی میں سچ کے سونے کی ڈلی ڈلکی.. سفر کا نام ہی کھوٹ ہے اور کھوج بھی ایک کھوٹ ہے، کھرا اور سچا سودا کس

کے بختوں میں ہے.. لیکن.. لائی لگ مومن سے کھوجی کافر بہتر ہوتا ہے.. تو کھوج کو کبھی ترک نہ کرو.. چاہے اپنا ایمان کھوٹا کرلو.. ویسے اے مُوسٰے..''

مُوسٰے بابا کی من موہ لینی باتوں میں اتنا مگن تھا کہ چونک گیا'' آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟''

''ہاں.. مجھے اس پانچ دریاؤں کے دیس کے باسیوں سے ایک شکایت ہے اور تم بھی اُن میں شامل ہو.. یہ کیا ہے کہ تم صرف اُن پیغامبروں کے پیغام پر ہی کان دھرتے ہو جو دور دیسوں کی بستیوں میں اترے، انہوں نے جو سبق پڑھایا تمہیں مُشکل سے یاد ہوا کہ اُن کی زبانوں سے تمہارے کان ناآشنا تھے اور تم نے مجھ سے محض اس لیے غفلت برتی کہ میں تمہاری مادری زبان میں تمہیں اپنے رب کی طرف بلاتا تھا، جن زبانوں کو تم سمجھتے ہی نہیں تھے اُن کا اعتبار کیا اور جو زبان تم بولتے تھے اُس میں اترنے والے صحیفوں کو درخور اعتنا نہ جانا.. میرے گرنتھ صاحب میں ذات پات اور دیس بھیس اور مذہب کی کوئی تخصیص نہیں.. میرے علاوہ سب صُوفی سنتوں اور درویش بھگتوں کا کلام شامل ہے.. جو بابا فرید نے کہا وہ بھی گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے تو جب وہ کہتا ہے..

ـ اُٹھ فریدا سُتیا صبح نماز گزار..

اُٹھ فریدا سُتیا جھاڑو دے مسیت.. تُوں سُتا، رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت..

تو کیا یہ کلام براہ راست بغیر ترجمہ کے تمہارے دل میں نہیں اترتا.. بس یہی شکایت ہے.''

''سفر کھوٹا ہو رہا ہے سچے صاحب..'' مردانے نے پھر احتجاج کیا'' کیا پتہ یہ کھرا ہو جائے..''

مردانے نے رباب کے تاروں کو جھنجھوڑا او وہ اپنی دُھن میں مست الست سچی سرکار کی شان میں گیت الاپتے مُوسٰے سے آگے نکل گئے..

ـ پربھ کے سمرن کارج پُورے..

■◆◆◆◆◆◆■

''فک یُوے مُوسے..'' صفورہ غرّائی ''کیا تُم سن رہے ہو..''

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا ''کیا ہے؟''

''تم نیند میں یہ کیسے جنتر منتر دوہراتے ہو.. کبھی ''سچ ہے سچ ہے'' بڑ بڑاتے ہو، کبھی کسی سمرن کا نام لیتے ہو.. اور پھر گہری نیند میں اتر کر خراٹے لینے لگتے ہو.. میں سو نہیں سکتی..''

''میں یہاں نہیں کہیں اور ہوں..''

''سبحان اللہ..'' صفورا شیر دل کی ووکیبلری میں زباں زد عام فحش اظہار کے ساتھ ساتھ تقدیس بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی.. ''تم کوشش بہت کر چکے.. میں نے تمہارے بیج کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی پر وہ نہیں سنبھلا.. نہ وہ پُورن شُورن کچھ کام آیا تو اگر یہاں نہیں ہو تو کہاں ہو..''

مُوسے پھر سے غافل ہو چکا تھا..

صفورا نے اپنا تکیہ بغل میں دابا اور بیڈ روم سے نکل گئی.. لِونگ رُوم کے صُوفے پر دراز ہو گئی.. نیند میں اترنے سے پیشتر اُس نے ایک بار پھر تکیے سے مخاطب ہو کر کہا ''فک یُو..''

■•◆•◆•◆•■

وہ سب سات پرندے.. بُدھ کی پسلیوں سے پیدا ہونے والے، سلگتی جھاڑی کی تپش سے فرار ہونے والے، عیسیٰ کی صلیب میں سے نمودار ہونے والے، غار حرا کے شگافوں میں بسیرا کرنے والے زرتشت کی مقدس آگ میں سے جنم لینے والا آتش زدہ، آتش پرست پرندہ.. کوچہ بہ کوچہ، چہرہ بہ چہرہ طاہر پرندہ.. اور میں ہی حق ہوں، میں حق ہوں کی تسبیح کرتا خون میں ڈوبا پرندہ.. سب کے سب پرندے آسمانی خیمے میں ٹھہرا نہیں کرتے.. کرشن پرندے کے ساتھ چُہلیں کرتے ٹلہ جوگیاں کی چوٹی کی جانب کب کے جا چکے تھے.. لیکن ان سب میں سراسر عشق کا، عشق مجازی سے ماورا عشق حقیقی کا اسیر کوئی پرندہ نہ تھا.. وہ سب نہایت پاکیزہ، روحانی اور عرشوں میں ڈھلے ہوئے نیک پرندے تھے، اپنے اپنے ذاتی عقیدے میں قید تھے، وہ آسمانوں سے لو لگائے، نجات اور آخرت کی تمنائی، کسی ایک شخصیت کے سحر میں گرفتار بہر طور نہایت ایمان والے پرندے تھے تو پھر عشق میں بے ایمان ہو جانے والے وہ پرندے کہاں ہیں جو بدن کی شہوت اور وصل کی لذتوں میں مبتلا تھے..

وہ کہاں ہیں جو عرش سے لَو نہیں لگاتے.. جو شرینہہ، دھریک اور کیکر کے مست الست، مہک نازک اندام والے پھولوں میں سے عشق کی مئے لالہ فام کشید کرتے ہیں جو عرش سے بغاوت کر کے اس مٹی میں سے پُھوٹنے والے گل بوٹوں، فصلوں، جوہڑوں اور بہاروں سے لو لگاتے

ہیں.. جن کی قوت پرواز آسمانوں سے نہیں اترتی، اس دھرتی کے سینے میں سے پھوٹتی ہے.. زمین کے اندر جو دل کا دِیا جلتا ہے یہ کسی طُور کی جلتی جھاڑی سے نہیں اُس کی روشنی سے منور ہوتے ہیں.. اُن کے پروں کی باریک ترین رگوں میں دوڑنے والے لہو میں پورے پانچ پانیوں کی آمیزش ہے.. جب پیاس سے بلکتی مٹی پر بارش کی پہلی بُوند گرتی ہے اور وہ اُس کے سُوکھے پن میں جذب ہو کر پاتال میں اترنے سے پیشتر ہی خشک ہو جاتی ہے تو اُس مٹی کی مہک میں سے فرزانے پرندے جنم لیتے ہیں.. یہ دیوانے پکھیرو نہ کسی پسلی میں، نہ کسی جھاڑی، صلیب یا شگاف میں گھونسلا بناتے ہیں، نہ کسی فرات میں، گہرے کنویں کے پاتال میں یا بندرابن میں بسرام کرتے ہیں.. دلِ عشاق کی خبر لیجیے تو یہ وہاں مقیم ہوتے ہیں.. انہیں سچ کی تلاش میں سات وادیاں عبور کر کے کسی قاف کے پہاڑ کی جانب پرواز کرنے کی حاجت نہیں ہوتی کہ اُن کا وجود پورے کا پورا سچ کا ایک معبد ہوتا ہے، وہ اپنے اندر جھانک لیں تو وہاں رب کے پہلو بہ پہلو اُن کا قبلہ اور کعبہ موجود ہوتا ہے..

اُن میں سے ایک پرندہ دانا باد کے گاؤں سے پرے ایک ویرانے میں جنڈ کے ایک گھنے شجر میں گھونسلا بنائے بیٹھا تھا.. اور وہ چشم دید گواہ تھا کہ جنڈ کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے صاحباں مرزے کی لاش کو گود میں لیے بیٹھی بین کرتی ہے جس کا دل اُس کے بھائیوں کے تیروں سے چھلنی ہو چکا ہے اور اُس نے دیکھا کہ صاحباں بھی اپنے بھائیوں کے تیروں سے گھائل ہو کر دم توڑ رہی ہے..

اور یہ جو پانیوں کا پنچھی تھا، دن کے وقت چناب کی سطح پر اڑانیں کرتا اُس کے سرد اور شفاف آئینہ پانیوں میں تیرتی مچھلیاں کا شکار کرتا تھا، وہ شب بسری کے لیے ایک کمہار کے کچے گھڑے میں پھڑ پھڑاتا روپوش ہو جاتا تھا اور وہی گھڑا اور سوہنی دریا میں ڈوب گئے تو وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اُس گھڑے میں سے نکل گیا اور تب سے آج تک اُس نے کسی اور گھڑے کو گھر نہ کیا..

ایک اور پرندہ جنگل بیلے میں رانجھے کی ونجلی کے سوراخوں میں سے سُروں کے ساتھ برآمد

ہوا تھا اور وہ بھی اُس مسلسل پرواز کرتے گھڑے سے فرار ہونے والے پرندے کے ہمراہ چناب کے پانیوں پر اڑانیں کرتا رہا.. تو یہ سب پرندے کہاں ہیں..

ہم یہاں ہیں.. ہم یہاں ہیں.. وہ تینوں اُس کی توجہ کے طالب کُوکنے لگے..

عرش کے پرندے رخصت ہو گئے تو زمین کے پرندے نمودار ہو گئے..

مُوسٰے حسین پر یلغار کرنے لگے..

اُس کے سر پر جو آسمانی گنبد ایک خیمے کی صورت ایستادہ تھا اُس میں ابھی تک رخصت ہو چکے پرندوں کے پَروں کی سرسراہٹ گونجتی تھی، رخصت ہو چکے پرندے سب کے سب تقریباً ہم شکل اور ہم نسل تھے، وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، وہ کسی ایک ماں کے جائے لگتے تھے.. کسی ایک ہی کوکھ میں سے اگرچہ مختلف زمانوں میں کُوکتے پیدا ہو گئے تھے..

لیکن اُس کے سر پر جو آسمانی گنبد ایک خیمے کی صورت ایستادہ تھا اُس میں اب جو پرندے گونجتے تھے.. اُن کی شباہتیں جُدا جُدا تھیں پر وہ بھی ایک ہی تسبیح میں پروئے ہوئے موتی منکے تھے، اُن تینوں میں حسن کی دل فریبی، وحشی کشش، ہولناک ہوس، بدن کی قربت، وصال کی مُنہ زور خواہش اور سحر انگیز دھڑکن کی دھک دھک مشترک تھی.. اُن کے نین کیا ہی جادو بھرے، دل میں جا کرنے والے، جا کر کے پھر نہ جانے والے تھے اور اُن میں ایسے چراغ روشن ہوتے تھے جن کی لو سے فرشتوں کے پر بھی جلتے تھے.. ان تینوں کی چھ مدھ بھری، ہری بھرتری ایسی سُرمہ زدہ مقتل آنکھوں میں چھ چراغ ہی جلتے تھے جن کی جھلملاہٹ میں اُن کی اپنی شکلیں ہی جھلملاتی تھیں، گویا آنکھیں نہ تھیں، آئینے تھے جن میں اُن کی اپنی ہی تصویراں نقش ہوتی تھیں.. وہ اپنے ہی رنگ میں رنگے ہوئے، تو من شدی، من تو شُدی کے جھلملاتے ہوئے نقش تھے..

مُوسٰے حسین اُن کی یلغار سے سہم گیا.. جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اُسے آپ گناہ اور

ثواب کے پلڑے میں تول کر قبول کر لیتے ہیں لیکن زمینوں میں سے پھوٹنے والی سچائیوں کو آپ قبول نہیں کرتے، اُن سے ڈرتے ہیں..

''تم کون ہو؟''

''ہم وہ ہیں جس کی تمہیں خبر نہیں..'' پرندے شمس تبریز کے پیروکار لگتے تھے..

اُن تینوں میں سے ایک پرندہ الگ ہو کر اترا اور مُوسے کی آنکھوں کے عین سامنے پھڑ پھڑاتا ساکت ہو گیا۔ تصویر ہو گیا.. بات کر کہ تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا تو وہ بات کرنے لگا.. اُس کے نازک بدن کی کوملتا میں تیر چھدے ہوئے تھے..

''میں صاحباں ہوں.. میرے بدن کی کچی کلی کی کنوارگی کو مرزے کے لمس نے کھلا دیا.. کھیوے کی بیٹی صاحباں ہوں جس کے حسن سے حُوریں بھی پردہ کرتی تھیں، میرے نین عشق کے سندور ہاتھی دلوں کو روندتے چلے جاتے تھے..''

ے حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا، پوش..

کہ ہٹ جاؤ.. میرے راستے میں آؤ گے تو روندے جاؤ گے.. میری چھاتی کا کیا بیان ہو ایک تختہ سیم کا جس میں دو لعل سلگتے ہیں.. میری ناف شراب کا وہ تالاب ہے جس میں سے عاشق گھونٹ بھرتے ہیں اور میری رانیں صندل سے تراشیدہ جو آپس میں کھہتی ہیں تو اُن کی رگڑ سے ایک ایسی مُشک پھوٹتی ہے کہ اُسے سُونگھتے ہوئے کیا انسان اور کیا چرند پرندے میرے وصال کی ہوس میں بے اختیار ہوتے ہیں، لیکن یہ صرف مرزا تھا جسے میں نے اس مُشک میں نہال ہونے کی

اجازت دی.. یہ صرف میں اور مرزا تھے جو عشق کے پرندوں میں سے قابل گردن زدنی ٹھہرے کہ اُس لُطف سے آشنا ہوئے جو سوائے بدنی ملاپ کے کسی اور شے میں نہیں ہے..

صاحباں کی ادائیں اور دل ربائیاں ایسی تھیں کہ مُوسٰے حسین کے بوڑھے دل پر بھی ڈاکہ پڑ گیا، وہ لُٹ گیا..

جونہی صاحباں اپنے حسن کا قصیدہ بیان کر کے معلّق حالت میں سے تحرک میں آ کر بلند ہوئی تو عین اُس کی خالی کردہ جگہ کو پُر کرنے والا دوسرا پرندہ اترا اور مُوسٰے کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر گیا.. وہ پرندہ جس کا حسن تمثیل ہوا.. ایک داستان ایک دلیل ہوا، دنیا بھر میں جہاں کہیں حسن کی آتش بھڑکتی تھی اس پرندے کے نام سے موسوم ہوئی کہ وہ سوہنی تھی.. اُس سے بڑھ کر اور کوئی سوہنا نہ تھا... کِناں سوہنا تینوں رَب نے بنایا جی کرے دیکھدا رہواں..

سوہنی نام آہا سوہنے نین اسدے
سوہنی ہنس تے مور دی چال آہی
سوہنے دند رخسار انار وانگوں
سوہنے مکھڑے تے سوہنی کھال آہی
سوہنے وال کمال دراز اس دے

جب وہ چناب کے لہروں پر تیرتی ہوئی اپنے مہینوال سے ملاپ کرنے کے لیے اس پار پانیوں سے ابھرتی تھی تو وینس ڈی میلو کے بدنی تناسب کو بھی حقیر کرتی تھی..وہ تو بھیگے ہوئے بدن کی ایک خدائی ہو جاتی تھی جس کے سامنے وینس ایک باندی کی مانند ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی.. ہر شب وہ دریا پار رانجھن کے ڈیرے پر جاتی تھی، ایک جل پری کی مانند تیرتی جاتی تھی اور

چناب کے پانیوں میں سے بھیگی بھیگی ظاہر ہوتی تھی تو اُسے دیکھ کر جنگل بیلے میں چہکتے پکھیرو گنگ ہو جاتے.. قلانچیں بھرتے ہرن فضا میں معلق ہو جاتے.. جنگلی سؤر گنّے کے کھیتوں کو اجاڑتے اپنی تھوتھنیاں زمین پر رکھ کر تائب ہو جاتے.. دریا کنارے صدیوں سے سیلابوں کی زرخیز مٹی میں سے ایسے ایسے بُوٹے جنم لینے لگتے جو کبھی نہ کسی نے دیکھے نہ سُنے.. یہاں تک کہ اُس مٹی کے اندر.. پوشیدہ اور زندگی کرنے والے جتنے بھی حشرات تھے، رینگنے والے روپوش جاندار تھے اُن تک بھی سوہنی کے سوہن کی کمندیں پہنچ جاتیں اور وہ اُن کمندوں پر رینگتے، اُن سے چمٹ کر زمین کی سطح پر نمودار ہو جاتے تا کہ اُس کی ایک جھلک دیکھ لیں.. سوہنی کے سوہناپے کی اور کیا مثال ہو..

وہ سوہنا من موہنا سونے کا ایک گہنا پرندہ بھی اپنا تعارف کروانے کے بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گیا اور اُس کی جگہ وہ آخری پرندہ آ گیا جس کی پور پور سے بانسری کی فریادیں پُھوٹتی تھیں.. یہ وہی پرندہ تھا جو مولانا روم کی مثنوی کے آغاز میں بانس کی ایک پوری کی مانند اپنے یار سے بچھڑنے کی دوہائیاں دیتا تھا...

تم نے پُوچھا تھا کہ ہم کون ہیں؟

تو میں وہ ہوں جو عشق کی ایک مثال ہوں.. ہیر سیال ہوں.. اپنے حسن کی فریفتگی میں باکمال، بے مثال اور بے حساب ہوں.. میں نہ ہوتی اگر ملکہ ہانس کی اُس مسجد کے حُجرے میں جہاں وہ امام تھا، ایک چراغ کی روشنی میں بیٹھ کر سیّد کہلانے والا وارث شاہ میرے دل کی لگی اور جذب کی داستان نہ رقم کرتا.. وہ سُخن کا وارث شاعر جس کے سینے میں ایک بھاگ بھری کے عشق کے شرارے بجھتے ہی نہ تھے.. اُس نے میرے حسن کا بیان کرتے عاجزی کا اظہار کیا کہ میں کیا لکھوں کہ ہیر کیسی تھی..

کہ..میرے ماتھے پر حُسن کا ماہتاب چمکتا تھا، میری بھنویں نہ تھیں لاہور کی کمانیں تھیں جو عاشقوں کے دلوں میں تیر اتارتی تھیں، میرے حُسن کا کچھ حساب نہ تھا، ہونٹ، سُرخ یاقوت سے تراشے ہوئے اور میں چین کشمیری کی تصویر جیّ جس کی قامت بہشت کے سرو بُوٹوں ایسی بلند تھی.. گردن کُونج کی، انگلیاں رواں پھلیاں اور ہاتھ اتنے کومل جیسے برگ چنار ہوں..میں ٹُتلی پیکنے کی تھی اور میرے نقش رُوم والے تھے..میرے روں روں میں سے عشق بولتا تھا، راگ جنم لیتے تھے اور جب میرے نینوں کا داؤ لگتا تھا تو کوئی بھی اُس جوئے میں جیت نہ سکتا تھا..

کہی ہیر دی کرے تعریف شاعر، متھے چمکدا حسن ماہتاب جی

وارث شاہ جاں نیناں دا داؤ لگے، کوئی بچے نہ جوئے دی ہار وِچوں

میں تو ایک معمولی سی پنجابی مٹیار تھی، جانے وارث شاہ نے مجھے کس آن میں دیکھا، مجھے شک ہے کہ اُس نے مجھے نہیں اپنی بھاگ بھری کو اِک آن میں دیکھا..میں تو محض ایک بہانہ تھی، اُس کے ذاتی عشق کا اِک افسانہ تھی..کیا تم آگاہ ہو کہ اگر تم ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر پہنچ گئے تو وہاں وہ ہوگا جس کا عشق میرے روں روں میں بولتا ہے..اُس کے پھٹے ہوئے کانوں میں بالیاں ہوں گی اور ماتھے پر تلک لگائے ہوگا، یہ وہ جوگی ہوگا جس کے لیے میں روگی ہوگئی..میں جاناں جوگی دے نال..کنّیں مندراں پا کے متّھے تلک لگا کے..اُسے کہنا کبھی میری چوکھٹ پر آ کر صدا دے تو میں جنگل بیلے اُس کے ساتھ چل دوں گی، اُس کا کشکول اپنی کنوارگی سے بھر دوں گی..جہاں پاؤں دھرے گا وہاں اپنا سر رکھ دوں گی..کبھی آئے تو سہی..

مُوئے حسین آس پاس کے نظاروں سے غافل ہوا اُن تینوں پرندوں کے حُسن کی یکتائی میں گم ہوا.. یہ فیصلہ کرنا محال تھا کہ کس کا حسن بقیہ پرندوں کے حسن کی یکتائی میں گم ہوا.. یہ فیصلہ کرنا محال تھا کہ کس کا حسن بقیہ پرندوں کے حسن کو گہنا تا ہے کہ وہ تینوں ایسے چمکتے ماہتاب تھے جو کبھی گہن سے آشنا نہ ہوئے تھے..

''کیا تم بھی اُن الوہی پرندوں کی مانند سچ کی کھوج میں اڑانیں کرتے ٹلہ جوگیاں کی بلندیوں پر پہنچنے کے آرزومند ہو؟''

''نہیں..'' صاحباں نے اپنے بدن میں سے اپنے ہی بھائی شمیر کا چلایا تیر کھینچ کر نکالا.. ''میرا سچ دانا باد ہے..''

ہیر کے بدن میں ونجلی کے سوراخوں میں سے.. ایک آہ نکلی..

''نہیں.. میرا سچ جنگل بیلے میں بچھا ہوا وہ رنگین پلنگ ہے. جس پر میں رانجھے کے ساتھ آپ ہی رانجھا ہوئی تھی..''

سوہنی بھی انکاری ہو گئی کہ نہیں.. میرا سچ میرے کچے گھڑے میں پوشیدہ ہے. جس میں سے میں نے جنم لیا تھا..''

''تو پھر تم تینوں اِدھر کدھر آ نکلے.. اگر تمہیں سچ کی کھوج نہ تھی؟''

''ہم صرف ادھر اس لیے آئے کہ خدائی جان لے کہ یہ جو اپنے تئیں آسمانوں سے اترے ہوئے، عقیدوں اور مذہبوں کے پرندے ہوتے ہیں وہ تو بشارتوں اور صحیفوں پر انحصار کرتے ہیں جب کہ ہم صرف عشق پر تکیہ کرتے ہیں جو اس مٹی میں سے جنم لیتا ہے. جس سے گوندھے گئے ہم حُسن کے کُوزے ہیں.. ہمارا آسمانوں سے کیا لینا دینا، ہمارے صحیفے وارث شاہ، حافظ برخوردار اور تحریر کرتے ہیں اور ہماری بشارتیں رانجھے، میرزے اور مہینوال کی صورت ہم پر نازل ہوتی ہیں، ہم

صرف یہی ثابت کرنے آئے تھے، آئے تھے اور اب چلے جاتے ہیں.."

وہ تینوں پلٹ گئے اپنے اپنے عشق تمام، عشق حصار، عشق بے شمار کی جانب.. اپنے اپنے دانا باد.. گجرات اور جھنگ کو لوٹ گئے.. اگرچہ مُوئے حسین نے اپنی آنکھوں سے اُن عشق میں باؤلے ہو چکے پرندوں کو چونچیں موڑ کر ٹلہ جوگیاں سے واپس جاتے دیکھا تھا، وہ دیر تک اُنہیں تکتا رہا، آنکھیں اُن پر مرکوز رکھیں، اُنہوں نے اپنی پرواز کا رُخ بدل کر پھر سے واپسی کا قصد نہ کیا تھا یہاں تک کہ زمین اور آسمان کے درمیان فاصلوں کے باعث جو دھندلاہٹ ایک فریب کی صورت دکھائی دیتی ہے وہ اُس میں معدوم ہو گئے تھے، آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے.. تو کیا واقعی وہ لوٹ گئے ہیں؟

مُوئے حسین کے من میں شک اور خدشے کی ایک موج اٹھتی تھی کہ اگرچہ وہ دھندلاہٹ میں گم ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے صرف اُسے ایک دھوکے میں مبتلا کرنے کے لیے واپسی کا سفر بظاہر اختیار کیا ہے اور انہوں نے بہرطور کسی اور آسمانی راستے سے پلٹ کر ٹلہ جوگیاں پر ہی جا اترنا ہے کہ وہ لاکھ انکار کریں کہ وہ اس مٹی سے گھڑے ہوئے پرندے ہیں اور اُن کا آسمانوں سے کوئی واسطہ نہیں لیکن.. واسطہ تو تھا.. ان تینوں کے رگ و پے میں، بال و پر میں عشق آتش کی جو چنگاریاں سلگتی تھیں وہ خود بخود تو سلگنے والی نہیں، جو چراغ جلتے تھے وہ کہاں آپو آپ جل اٹھنے والے تھے.. اُن کے لیے آسمانوں سے کمک آئی تھی..

صاحباں کا مرزا نوشہ پیر کی دعا کی برکت سے جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ٹھہرا رہا، نویں مہینے بھی ظاہر نہ ہوا تو نوشہ پیر کے معجزے سے وہ بارہویں مہینے جا کر پیدا ہوا.. تو کیا وہ اُس پیر کے آسمانی رابطوں سے انکاری ہو سکتی تھی، ہیر کے لیے وارث شاہ نے پانچ پیروں کے واسطے دیئے تھے اور سوہنی بھی کچے گھڑے کو رب کے واسطے دیتی تھی..

۔ سوہنی گھڑے نوں آکھدی۔ اج میّنوں پار لنگھا گھڑیا

چنانچہ انہوں نے آسمانی پرندوں سے میل کرنے کے لیے لوٹنا تھا اور اُن کی کانفرنس میں شریک ہونا تھا..

یہ دھوپ تھی جو اُس کے دماغ کے خلیوں میں سرایت کر کے اُنہیں یوں پگھلا رہی تھی کہ اُن کی اتھل پتھل میں سے ایک عجیب خیال نے جنم لیا..ایک ناممکن خواہش، ایک ناقابل عمل تخیل.. کہ وہ جو آسمانی صحیفوں میں سے پھڑ پھڑاتے برآمد ہوتے الوہی پرندے تھے اور یہ جو مٹی سے جنم لینے والے عشق کی بھٹی میں پکے ہوئے زمینی پکھیرو تھے اگر یہ رضا و رغبت آپس میں میل کر لیں، اختلاط کر لیں تو ان کے بطن سے کیسے انوکھے پنچھی پیدا ہو جاویں گے..آسمانی مذاہب اور مٹی کے مذہب کے وصل سے پرندوں کی ایک ایسی انوکھی نسل جنم لے گی جو دنیا بھر کے سب جھگڑے جھیڑے، اختلاف، انکار، ملیامیٹ کر دے گی..آسمان، مٹی ہو جائے گا اور مٹی آسمان ہو جائے گی..

اگر یہ ناممکن، ممکن ہو جائے تو کیا ہو سکتا ہے..سوہنی اور بُدھ پرندے کے ملاپ سے ایک پرندہ انڈے کا چھلکا اپنی چونچ سے توڑ کر نمودار ہوگا، کیسے بھلے رنگ رُوپ کا ہوگا..اُس کے پروں پر اُس برگد کے پتّے نقش ہوں گے جس کے تلے مہا آتما نے گیان پایا اور اُس کا کومل بدن چناب کے پانیوں میں نہایا ہوا ایسا ہوگا کہ زندگی بھر کبھی بھوکا یا پیاسا نہ ہوگا..

صاحباں اگر اُس جنڈ کے شجر کی بجائے ایک جلتی ہوئی جھاڑی کی آگ میں جھلسے ہوئے پرندے کو اپنا آپ سپرد کر دے تو اُس سپردگی کے نتیجے میں ایک ایسا پرندہ جنم لے سکتا ہے جس کا بدن

جلتا ہو، اور وہ کسی دریا کے نیلونیل پانیوں پر اپنی چونچ رکھ دے تو وہ دونیم ہو جائیں اور اُن کے درمیان میں سے عشق کے قافلے گزر جائیں..

ے دِھی کھیوے دی صاحباں جس تے حُوراں گھُنڈ کڈّن
صاحباں دے نین سندورے عشق دے ہاتھی مست پھرن

اگر کوہ طور کی جھاڑی اور دانا باد کا جنڈ شجر آپس میں بیاہے جائیں..
ہیر سیال کا کیا بیان کرے کوئی.. اگر وہ عیسےٰ کی صلیب پر بیٹھے اُس پرندے کی دلہن ہو جائے جو اُس کے پیاسے کھُلے دہن میں بوند بوند پانی اپنی چونچ سے گراتا تھا..

ے تیری سیپ اُتّے وسیا ابرنیساں
وچوں پیدا ہوئے گا موتی مُل دانیں

جو محال ہے اگر وہ ممکن ہو جائے تو ہیر کی سیپ پر ایک ابرنیساں برسے، صلیب کے پرندے کی پیاس کی ایک بُوند اُس سیپ میں سرائیت کر جائے تو کیا جانیے اس ملاپ سے کیسا پرندہ عجب ظاہر ہو جائے.. جس کی خصلت میں ہیر کی سرکشی اور عیسےٰ کی دوسرا گال پیش کر دینے والی تلقین ہو..
یہ مخلوط پرندے، عرش اور فرش کے ملاپ سے جنم لینے والے اس زمین پر اڑتے پھریں، اذیتوں کے مارے لوگوں کے زخموں کا مداوا ہو جائیں، سب جھگڑے تمام ہو جاویں..

■•◆•◆•◆•■

طویل کوہستانی مسافتوں کے دوران آپ کے پاؤں لحہ بہ لمحہ بلند ہوتی چڑھائی کے عادی ہو جاتے ہیں، انہیں عادت ہو جاتی ہے کہ اگلا قدم ہموار سطح پر نہیں، ایک چڑھائی پر پڑے گا، پھر جونہی پہاڑی سفر کے اختتام پر آگے کی زمین ہموار ہو جاتی ہے تو پاؤں دھپ سے اُس سطح پر پڑتا ہے اور آپ لڑکھڑا جاتے ہیں کہ انہیں دوبارہ پھر سے ہموار زمین پر چلنے سے دِقت ہوتی ہے.. پھر سے ہموار جگہ پر چلنے کی عادت دو چار روز بعد ہوتی ہے..

مُوئے حسین کے قدموں تلے جو پتھریلا، جھاڑ جھنکار میں اٹا راستہ بلند ہوتا آیا تھا، یکدم ہموار ہوا تو وہ لڑکھڑا گیا..

چڑھائی کا اختتام ہو گیا تھا..

شکستہ گنبد والی وہ کھنڈر ہو چکی عمارت جس میں بابا نانک نے چلّہ کاٹا تھا، وہ اجڑ چکا مندر جس کے اندر پہنچ کر ہری بھرتری، نوا پردازِ ہند، نکتہ آرا اور نوائے ارجمند رکھنے والا وہ بادشاہ جس کا فقر میں ایک مقامِ بلند ہے اور وہ خود جم اور اُس کے شعر کو رُومی جام جم کہتے ہیں، وہ جادوگرِ ہند نژاد ہری بھرتری، اُس کے فقر کی مسافتوں کا اختتام ہو گیا تھا..

پُورن بھگت نے بالناتھ کا چیلا ہونے کے بعد جس کوٹھڑی میں دھونی رمائی تھی، اُس کی چھت اپنی چار دیواروں کے بیچ گر کر ڈھیر ہو چکی تھی..

جلال الدین اکبر نے جوگیوں کی فرمائش پر جو تالاب تعمیر کیا تھا جو کب کا خشک ہو چکا تھا

اور اب تو اس پر پرندے بھی نہیں اترتے تھے، جس کے کناروں پر کبھی تخت ہزارے کا رانجھا کان پھڑوا کر بالناتھ کا جوگی ہو گیا تھا، اِن سب اجڑ چکے بام و در میں، کائی زدہ دیواروں اور شکستہ گنبدوں اور بے چراغ طاقوں اور مُورتیوں سے خالی ہو چکی محرابوں میں چمگادڑیں بسیرا کرتی تھیں.. یہاں تک کہ ماضی کے ان سب مزاروں پر سایہ کرتے جتنے بھی قدیم شجر تھے اور ان میں جنگلی زیتون کا وہ ایک درخت بھی ابھی تک موجود تھا جس کا پھل بابا نانک نے چکھا تھا اور اسی لیے وہ آج بھی ثمر آور تھا.. اُن سب کی شاخوں اور ٹہنیوں کے ساتھ سیاہ چمگادڑیں لٹکتی تھیں...

مُوسے حسین کے کانوں میں ان بے شمار باتونی چمگادڑوں کی چہک چہک چیں چیں اتری تو وہ اُس کے تن بدن میں سنسناہٹ کی ایک کپکپی طاری ہو گئی.. کیا واقعی، کیا واقعی.. میں چوٹی پر پہنچ رہا ہوں..

منزل آ گئی تھی..

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ منزل کے دو گام رہ جانے پر اُس کے قدم تیز ہو جاتے.. لیکن وہ رُک گئے..

کیا منزل پر پہنچ جانا ہی اس حیات کی آخری تکمیل ہے..

جس منزل تک پہنچنے کے لیے میں نے اتنا طویل کٹھن پہاڑی راستہ طے کیا.. اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، اپنی ہڈیوں کو بھر بھرا کر دیا، بدن کو شکستہ کر ڈالا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ آخر اس کمر توڑ کاوش کا حاصل حصول کیا ہوگا تو اگر میں منزل پر پہنچ جاتا ہوں تو یہ صرف میری انا اور خود غرضی کی تسکین کے سوا اور کیا ہے، نفس کے تکبر کے سوا کیا ہے... آؤ انا کی اس پچھل پیری چڑیل کے اُلٹے پاؤں کو باندھ دیں، خود غرضی کے کینچوے کو مسل دیں، نفس کے ہر سانس کے ساتھ پُھولتے ٹُتے کو ہلاک کر ڈالیں.. لوٹ چلیں..

اُس نے لوٹ جانے کا قصد کر لیا..

لوٹ جانے کو تھا.. چوٹی سے مُنہ موڑ کر ڈھلوان پر پاؤں رکھنے کو تھا جب چاروں اُور چہچہاہٹ کا ایک اور شور مچ گیا..اور اس شور میں چمگادڑوں کی چھک چھک چیں چیں کی آوازیں دفن ہو گئیں..اُنہیں خبر ہو گئی تھی کہ وہ لوٹ جانے کو ہے..

سب کے سب..جلتی جھاڑی والے، داؤد کے نغمے الاپتے، عیسیٰ کے خون کی بُوندوں میں متشکل ہونے والے..اُن شگافوں میں بسیرا کرتے جن میں سے چاندنی کے جزیرے اترتے تھے آتش زدہ، آتش پرست، کوچہ بہ کوچہ، انا الحق سب کے سب پرندے..وہ سب فریادیں کرتے نازل ہو گئے.."تم نے اُنہیں کیوں جانے دیا؟"

"کنہیں؟"مُوسےٰ حیرت زدہ اُن سے گویا ہوا..

"اُنہیں.."سب نے اُسے ایک مجرم ٹھہرایا.."کبھی تم نے دھیان کیا کہ ہم سب اپنے اپنے مقدس مسکنوں سے جدا ہو کر، انہیں ترک کر کے، ہجرت کر کے آخر کیوں اس ٹلہ جوگیاں کے مسافر ہو گئے..اس لیے کہ ہم اپنی تکمیل کے آرزو مند تھے..ہم تو روکھے پھیکے آسمانی نزول میں لگے بندھے تھے اور ہم اگر تلاش میں نکلے تو اپنے آپ کو اس کائنات کے آخری سچ سے وصال کرنے کی خاطر نکلے اور تم نے انہیں جانے دیا.."

"میں اُنہیں کیسے روکتا.."مُوسےٰ ان کی چرب زبانی سے بیزار ہو گیا.."اور کیوں روکتا..وہ سب کے سب تو عشق کے بے ایمان پرندے تھے اور تم تو ایمان والے ہو اگرچہ ابھی تک شک شبے کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہو اور اپنے بادشاہ سی مُرغ کی تلاش میں دربدر ہوتے ہو..نہیں جانتے کہ قاف کے پہاڑ کے پردوں کے پیچھے جو سچ پوشیدہ تھا..جو ہو بہو تمہاری شکل کا تھا تو کیا وہ واقعی سچ تھا یا ایک سراب تھا.تمہارا اُن سے کیا موازنہ، وہ تو یہ بھید کب کے جان چکے..سچ کے راز داں بس وہی ہیں..اُنہیں تمہاری طرح بھٹکنے کی کچھ حاجت نہیں.."

''اگر سچ پوچھتے ہو تو سچ کہتا ہوں.'' بدھ پرندہ بہت ہی لاغر ہوا جاتا تھا. ''یہ جو کرشن پرندہ رنگ رنگیلا اتنا معصوم بنا پھرتا ہے یہ اتنا چاپلوس اور مفاہمت کرنے والا تھا کہ اُس نے مجھے بھی اپنے سینکڑوں خداؤں میں شامل کر کے میری شناخت کو دھندلا کر دیا..''

''یہ کیا گلے شکوے، شکائتیں اور حکائتیں شروع ہو گئی ہیں..'' جُھلسے ہوئے پروں والے پکھیرو نے مداخلت کی ''دیکھو اے مُوسٰے..میرے پیغمبر کے ہم نام.. یہ ہماری بقاء کا سوال تھا، ہم نے طے کر لیا تھا کہ مذہب کا سچ ہی آخری سچ ہوتا ہے..یہ ہماری انا کا سوال تھا کہ ہم کسی اور سچ کو تسلیم نہ کرتے..عشق سے ہم نے ہمیشہ اجتناب کیا..یہ ہمیں بھسم کر دینے اور فنا کر دینے والی آتش تھی جس کا اپنا کوئی مذہب نہ تھا، اگر ہم تسلیم کر لیتے تو نہ کلیسا کا گھڑیال بجا کر دنیا کو موت کی خبر دینے والا کوئی پادری ہوتا...نہ دیوارِ گریہ سے لپٹ کر جہنم کی آگ سے بچاؤ کے لیے کوئی آہ وزاری کرتا..اور نہ کوئی غلاف کعبہ سے لپٹ کر اُسے چومتا مغفرت کا طلب گار ہوتا..ہم عشق سے مفاہمت کر لیتے تو ہمارا روزگار ٹھپ ہو جاتا..جانے کس بدبخت فلسفی نے کہا تھا کہ اگر مذہب میں سے موت کے ڈر کو خارج کر دیا جائے تو مذہب اپنی موت آپ مر جائے گا..توبہ توبہ..اُس فلسفی مردود کو کیا پتہ کہ موت کے بعد مرنے کا منظر کیا ہوتا ہے..اور اس منظر کے پیش کار ہم سب پرندے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم سب نامکمل ہیں..''

البتہ آتش پرست، کوچہ بہ کوچہ اور انا الحق پرندے قدرے لاتعلق نظر آتے تھے، بدھ پرندہ مُوسٰے سے آنکھیں چُرا رہا تھا تو مُوسٰے نے اُسی کی مجرم سی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ''تم تو اپنے ان ہم پروازوں کی مانند موت کی دھمکیاں دے کر خلق خدا کو نہیں ڈراتے..تمہارے ہاں تو کوئی روز حشر نہیں ہے..نہ کوئی جنت نہ کوئی دوزخ..انسان بار بار رُوپ بدلتا اسی دنیا میں اپنے کیے کی سزا پاتا ہے، یہی تمہارے دھرم کی پہلی اینٹ ہے..''

''میرے رفیقوں کے ہاں تو روزِ آخرت اور سزا جزا کے یہی سوال جواب قضیئے ہیں اور سچ جانو کہ ان کی مسلسل رفاقت کے دوران مجھے بھی کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ کیا پتہ بھیتر میں مہاتما بھی انہی حیات بعد از موت اور روزِ قیامت کے وسوسوں میں مبتلا تھے پر اقرار نہ کرتے تھے.. اور یوں میں یقین نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے ساتھی پرندوں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا ہوں، بحث کرنے سے فائدہ کہ نہ یہ اپنے عقیدے سے ذرّہ بھر انحراف کریں گے اور نہ ہی میں ان سے اتفاق کروں گا تو چُپ کے گھونسلے میں امن کی فاختہ کو رہنے دو.. چونکہ میں ان کا بزرگ بھی ہوں تو میں ان سب کو شانتی کا درس ہی دے سکتا ہوں..''

''بزرگ تو میں ہوں..'' کرشن پرندے نے سہمے ہوئے مداخلت کی..

بُدھ کے علاوہ دیگر پرندے غضب میں آ گئے.. اُن کی کھلی ہوئی چیختی چونچوں کے درمیان میں اُن کی جونکیں زبان سُرخ سنپولیوں کی مانند تھرکنے لگیں ''کرشن ایسے پاکھنڈ مت کرو، ہم نے اگر بجھے دل سے تمہیں قبول کر لیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی بزرگی کے حوالوں سے برتر ہونے کے دعوے کرنے لگو.. تم کوئی باقاعدہ پرندے تھوڑی ہو.. ہماری طرح الوہی پانیوں میں سے جنم لینے والے تھوڑی ہو.. تمہاری پیدائش تو اوہام، من گھڑت داستانوں، قصّے کہانیوں کی دلدل میں سے ہوئی.. انسان کو ذات پات کے زہریلے ناگوں میں لپیٹ دیا صرف اس لیے کہ براہمن جاتی اُن پر راج کر سکے... بندروں، ہاتھیوں، سانپوں، چُوہوں، مویشیوں کو خدا ماننے والے.. انسان کو کیڑا مکوڑا بنا دیا اور کیڑے مکوڑوں کی تعظیم کے لیے تمہارے ہی کچھ بھائی بند ننگے پاؤں چلے کہ وہ ہلاک نہ ہو جائیں، سانس لیتے ہوئے بھی دھیان رکھا اور منہ پر ململ کا نقاب اوڑھ لیا.. اور ہم.. ہم صرف ایک رب کے سامنے جھکتے ہیں جو نُور ہی نُور ہے، پوتر ہے پاک ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور تم... جو بھی سامنے آئے، جو بھی جانور یا شجر، قد آور یا زہریلا ہو اُس کے سامنے جھک جاتے ہو..

انسانوں کا خون پی جانے والی کالی کے پجاری ہو.. اور تم میں کچھ شرم حیا نہیں. تمہاری بہو بیٹیاں لِنگ کو بوسے دیتی ہیں.. ننگ دھڑنگ بھبھوت سادھوؤں کی ایستادگی پر پھول چڑھاتی ہیں.. ذرا پرے ہو کر بیٹھو.. تم سے تو گھن آتی ہے..''

''میرے پاس ان سب الزامات کے جواب ہیں ہم جن کی پرستش کرتے ہیں اُس کی توجیہہ ہے، قصے کہانیوں کی دلدل میں تم بھی اترے پر میں بحث نہیں کروں گا. تم اپنے آپ کو صرف اس لیے برتر جانتے ہو کہ تم پر تورات، بائبل اور قرآن آسمان سے اترے تو مجھ پر بھی دنیا کی پہلی دانش کے وید اُترے.. رامائن کا نزول ہوا.. دنیا کے سب سے بڑے رزمیے مہابھارت ایسا ادبی شاہکار نازل ہوا جو ہومر کے یونانی رزمیے سے کہیں بڑھ کر عظیم ہے.. اور تم پر سب کچھ بہت بعد میں اُترا، مجھ پر پہلے اترا.. بُدھ سے بھی پہلے نازل ہوا..''

''جھوٹ جھوٹ..'' پرندوں نے غدر مچا دیا ''تم بے حرمتی کا ارتکاب کر رہے ہو جس کی سزا موت ہے.. یہ تمہارے وید، مہابھارت اور رامائن وغیرہ تو کائیاں براہمنوں اور جعلی سنت سادھوؤں کی تحریریں ہیں، آسمانوں سے تو نہیں اتریں..''

''میں بھی شک کر سکتا ہوں کہ تمہارے آسمانی احکام بھی تمہارے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں..''

''ہم آسمان ہیں.. آسمان ہیں اور تم زمین ہو، زمین ہو..''

''مجھے اس پر کچھ شرمندگی نہیں ہے..''

''یہ تو قابل گردن زدنی ہے.. توہین کا مرتکب ہوتا ہی جاتا ہے..'' وہ سب اُس پر پل پڑنے کو تھے جب مُوسٰے حسین نے کڑک کر مداخلت کی ''بھلے تم اس کے زمینی سچ کو قبول نہ کرو لیکن دہشت گردی پر تو نہ اتر آؤ.. اگر تم اس کرشن کے سچ سے انکاری ہوتے ہو تو یہ بھی تم پر توہین کا مقدمہ کر سکتا ہے.. اسے مت مارو..''

کرشن پرندے کے حواس قدرے بحال ہوئے کہ وہ خوفزدگی کی لرزش سے باہر آیا اور بُدھ پرندے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''مجھ ان سے کوئی گلہ نہیں کہ یہ میری زمین میں اگرچہ ابھی تک اپنی جڑیں نہیں پھیلا سکے، اجنبی ہی رہے لیکن شکایت تم سے ہے، تم نے میرے دفاع کے لیے اپنی چونچ کیوں نہیں کھولی، آخر تم بھی تو درآمد شدہ نہیں ہو، اسی دھرتی کے بُوٹے ہو۔''

بُدھ پرندہ وہ کچھ کہنا نہ چاہتا تھا جو کچھ کرشن پرندے نے اسے کہنے پر مجبور کر دیا ''سنو میرے بزرگ بھائی.. میں تمہارے دفاع کے لیے کیوں اپنی چونچ کھولوں.. تم نے کبھی کسی نئے پرندے کو تسلیم نہیں کیا، ہمیشہ اسے اپنی چالاکی کے جال میں شکار کر کے اپنے آپ میں مدغم کر دیا اور تم تو مجھے بھی کھا گئے.. اس لیے کہ میں پورے ہندوستان پر چھا گیا تھا.. تمہارے مندر اجڑ گئے، گھڑیال اور سنکھ خاموش ہو گئے.. دیوداسیوں کے جنسی رقص تھم گئے.. پروہتوں کے راج کا خاتمہ ہو گیا اور اُس کی جگہ مہاتما کا امن اور آشتی کا پیغام ہندوستان کے روایت اور جہالت کی زنجیروں میں براہمن کے جکڑے ہوئے سماج پر حاوی ہو گیا.. اور تم فرار ہو گئے.. صرف اس لیے کہ ہم پرندوں کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنے والوں میں سے نہیں تھے، اُنہیں دانہ دُنکا ڈالنے اور پانی پلانے والے تھے.. ورنہ تم کب کے نابود ہو چکے ہوتے.. اشوک نے تلنگا کی جنگ کے میدان میں بکھری ہوئی بے انت لاشوں کے انبار دیکھ کر اپنا رُخ تمہاری خون آشامی سے موڑ کر مکمل امن کی جانب.. مہاتما کی جانب کر دیا.. ہندوستان کی سب ریاستیں بُدھ مت کی پیروکار ہو گئیں.. تم چینی راہب فاہیان کا سفرنامہ پڑھ لو تو جان جاؤ گے کہ پورا ہندوستان مجسّموں سے پاک ہو گیا تھا، سب ہاتھی، بندر اور چوہے فرار ہو گئے تھے.. میں نے ہی گندھارا عظیم سنہری عہد کو جنم دیا.. فاہیان کے بقول صرف وادئ سوات میں سولہ ہزار بُدھ خانقاہیں تھیں جن میں ہزاروں بھکشو دنیا بھر کے علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے جن میں ہاتھی کی سواری، مجسمہ سازی کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے شعبے بھی تھے اور

جولیاں کی درس گاہ کے کھنڈر اب بھی اُس سنہری عہد کے اجڑے ہوئے گواہ ہیں.. تخت بائی، طوطا کان، اودھے گرام، بٹ گرام، منگورا، جہان آباد اور پشاور کی وہ ڈھیری جس کی کھدائی کرنے پر مہاراج کنشک کے عہد کی وہ صندوقچی برآمد ہوئی تھی جس میں مہاتما کی راکھ محفوظ تھی.. ٹیکسلا کے دھرمارا جیکا سٹوپے کا سنہری گنبد ایک ایسا عجوبہ تھا جسے دیکھنے کی خاطر بدھ بھکشو تبت، چین اور کوریا سے چلے آتے تھے، ان سب شانداریوں کو تم نے اجاڑ دیا.. یہاں تک کہ مجھے دربدر ہونا پڑا.. دُور کے دیسوں نے مجھ پناہ گزین کو قبول کرلیا تو میں کیوں تمہارے دفاع میں اپنی چونچ کھولوں..''

کرشن پرندہ شرمندہ ہوا اور پھر اپنے پروں سے خجالت جھاڑ کر کہنے لگا ''میں نے تو تمہارے مہاتما کو بھی اپنے خداؤں میں شامل کرلیا.. اُسے مان لیا.. میں نے بے شک تمہارے مہاتما کو اپنے بے انت خداؤں میں شامل کر کے ان کے وجود کو نابود کر دیا لیکن.. یہ جو غارِ حرا والا پرندہ ہے.. یہ بہت سخت جان واقع ہوا ہے.. یہ وہ اخروٹ ہے جسے میں نے اپنے دانتوں تلے دبا کر توڑنے کی کوشش کی تو اس میں چند دراڑیں تو آئیں پر یہ ٹوٹا نہیں.. بہت سخت جان ہے، لگتا ہے کہ اس نے میری دھرتی میں جڑیں پکڑ لی ہیں اور یہ تو اُکھڑنے والا نہیں..''

''دوستو، ہم آپس میں ہی اُلجھ پڑے..'' عیسیٰ پرندے نے بہت دیر بعد چونچ کھولی..

''نہیں.. آپ صرف مجھ سے اُلجھ پڑے..''

''کرشن بھیا..'' جُھلسے ہوئے پرندے نے اُس کی جانب دوستی کا پَر بڑھایا..

''کس کا دوش ہے کس کا نہیں، یہ زمانے اس کا فیصلہ کرنے کے نہیں.. ہم تو ٹلّہ جوگیاں سے اتر کر اس مُوئے کی قربت میں اس لیے پھڑ پھڑاتے تھے کہ اس سے شکایت کریں کہ آخر اس شخص نے عشق کے اُن تین زمینی پرندوں کو کیوں نہیں روکا.. ہم اُن کے بغیر نامکمل ہیں، یہ شکایت کرنے کی خاطر اترے تھے.. کیوں مُوئے تم نے اُن عشاق کو کیوں جانے دیا؟''

''واہ جی واہ..'' مُوسےٰ کے لہجے میں ایک کڑوا طنز گُھلا ہوا تھا.. ''تم خود ان سے خوف کھاتے تھے کہ کہیں لوگ تمہارے آسمانی عقیدے ترک کر کے اُن پر ایمان نہ لے آئیں اور تم معدوم نہ ہو جاؤ اور اب اگر وہ رخصت ہو کر تمہارے لیے میدان خالی کر گئے ہیں کہ جو جی میں آئے کرتے پھرو..تو پھر کیوں اُن کی واپسی کے لیے مرے جاتے ہو؟''

''ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ اُن کی شریعت کے بغیر ہم روکھے پھیکے رہ گئے ہیں، عشق کے بغیر عبادتیں محض بدنی ورزشیں ہو گئی ہیں..ہمارے درمیان بہت سے عشق کے بہت پرندوں نے جنم لیا جن کے گلے ہم نے گھونٹ دیئے، سُولی پر چڑھایا، سنگسار کر دیا، جلا کر اُن کی راکھ دریاؤں میں بہا دی..''

''یہ ہم ہیں، یہ ہم ہیں..'' لاتعلق بیٹھے آتش پرست، کوچہ بہ کوچہ اور انا الحق پرندوں نے دوہائی دی..

''اور یُوں ہم سب بے روح اور مُردہ ہو گئے..یکدم نہ ہوئے..دھیرے دھیرے ہو گئے اور ہم اُس مُردنی کو محسوس بھی نہ کر سکے..یہ نہ جان سکے کہ عشق کے خمار کے بغیر جو بلال، اویس قرنی، حلّاج، طاہرہ، سینٹ آگسٹائن اور بھگت کبیر ایسوں کی جنوں خیزی سے کشید ہوتا ہے، اُس کی آمیزش کے بغیر عقیدے کی شراب محض سادہ پانی میں بدل جاتی ہے..تو پلیز ہمارا یہ کام کر دو، اُنہیں واپس بلا لو..''

مُوسےٰ حسین منہ کھول کر یوں ہنسنے لگا کہ اس کے دانتوں کے شگافوں میں سے دھوپ کی چمک داخل ہو کر اُس کے تاریکی میں دفن حلق کو بھی روشن کرنے لگی ''کیا میرے بلانے سے وہ واپس آ جائیں گے؟''

''تم ہماری آخری امید ہو، اُن سے کہو کہ ہم اپنے گئے دنوں کی غفلت پر شرمندہ ہیں.. مُوسےٰ، طُور کی سلگتی جھاڑی میں ہماری خواہشوں کے کچھ خس و خاشاک جھونکو، شاید وہ بھڑک اٹھے اور وہ اُس کے نور کی کرنوں کے دامن تھام کر واپس آ جائیں..وہ آئیں تو ہم اُن کو سر آنکھوں پر بٹھا کر

اپنے ہمراہ ٹلہ جوگیاں کی آخری بلندیوں تک لے جائیں گے..'' وہ جانے والے نہ تھے، اپنے اپنے پر سمیٹ کر ایک جھاڑی میں بسیرا کر گئے..

''انہیں بلاؤ.. ہم اُن کو راستہ دکھائیں گے.. بلکہ نہیں ہم اُن کے پیروکار ہو کر اُن کے راستے پر گامزن ہو جائیں گے..ہم انتظار کریں گے قیامت تک کہ قیامت آئے تو وہ آئیں..''

انہوں نے خواہش کی کشتی پر اپنے پروں کے بادبان باندھے اور اسے انتظار کے گہرے تاریک سمندروں میں دھکیل دیا..انتظار کے سمندروں کا کوئی انت نہیں ہوتا، طویل آبی مسافتوں کے بعد کوئی ایک جزیرہ پانیوں میں سے ابھرتا ہے اور جونہی وہ کشتی اس کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے لگتی ہے وہ جزیرہ ایک سراب کی مانند ڈوب جاتا ہے..منتظر پرندوں پر بہت سے زمانے اور موسم بیت گئے..وہ لاغر ہونے لگے، بے جان سے ہو کر جھاڑی میں سے گرنے لگے..

مُوسٰے بھی ایک اونگھ میں اتر چکا تھا جب نیم مُردہ ہوتے طُور کے جھلسے ہوئے پرندے کے بدن میں سے ایک ایسا چراغ روشن ہوا جس نے جلتی ہوئی جھاڑی کی سلگاہٹ سے جنم لیا تھا..

بُڈھ پرندے کے بدن میں ایک دو بوند لہو ابھی باقی تھا، یہ ریاضتوں کے تیل کی آخری بوندیں تھیں جن سے ایک نہیں دو دیئے جل اٹھے..

اور وہ پرندہ جس نے ابن مریم کے پیاسے حلق میں بوند بوند پانی ٹپکایا تھا..اُس کی چونچ میں بھی ایک چراغ تھا جو دمِ عیسےٰ کی مسیحائی سے بھڑکنے لگا تھا..کرشن کے بندرابن کے اندھیارے بھی دور ہونے لگے..

غارِ حرا کے پنچھی کے بدن پر اُس کے شگافوں میں سے داخل ہونے والی چاندنی کے جزیرے بجھ گئے اور اُس کے روئیں روئیں میں مصطفٰے کے عشق کے جتنے روئیں تھے، سینکڑوں ہزاروں تھے، اتنے ہی چراغ جلنے لگے..

اور تب ہر سُو روشنی ہو گئی..

خواہش کی کشتی پر بندھے اُن سب کے بادبان پُرانتظار کے سمندروں کے سفر سے لوٹ آئے تھے..

سب جھاڑیاں، پستہ قد شجر، جھاڑ جھنکار، راستے کے پتھر اور ان کے درمیان میں نمودار ہوتی گھاس یہاں تک اُس گھاس کے سُوکھ چکے تنکے.. چوٹی تک آنے والے راستے پر جتنے بھی نقش تھے، جوگی بالناتھ، ہری بھرتری، چرواہے عیسےٰ کے، پُورن بھگت، بابا نانک اور رانجھے کے سب کے سب اُس روشنی میں یوں نمایاں ہوئے جیسے وہ ابھی ابھی یہاں سے گزرے ہوں..

اور تب اس لیے ہر سُو روشنی ہو گئی کہ اُس نے اندھیاروں سے مخاطب ہو کر کہا تھا، اے روشنی ہو جا..

مُوسےٰ جو ایک اونگھ میں چلا گیا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا، خیرہ کن روشنی کی دمک کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھوں پر ہتھیلی کا سایہ کر کے بڑبڑایا..کیا طور کی جھاڑی اتنے ہزاروں برسوں تک بجھی رہنے کے بعد پھر سے سلگ اٹھی ہے، کیا عیسےٰ کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں پھر سے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں اور کیا پھر سے اقرأ کا پیام آ رہا ہے..

یہ سب روشنی کی قیامتیں، شانداریاں اور جگمگاتی آنکھیں چندھیاتی حیرانیاں ہر سُو سونے کے اُن گھنوں کی مانند جو سورج کی پہلی کرن کی زد میں آ کر ایک سنہری لَو دینے لگتے ہیں ان کی مانند لشکتی جاتی تھیں..یہ اُن کی واپسی کی نشانیاں تھیں..

وہ لوٹ رہے تھے..

وہ جو روشنی ہر سُو روشن ہو رہی تھی اُنہیں راستہ دکھانے کے لیے اُن کے پروں تلے بچھنے

کے لیے روشن ہوئی تھیں..

تاریک پانیوں پر ابھی تک ایک دُھند تیر رہی ہوتی، اُن کو روشن ہونے کا اذن نہ ملتا اگر وہ نہ آتے..

جتنے بھی دیئے جل اٹھے، چراغ بھڑک اٹھے، وہ سب کے سب اُن کی آمد کی دلیل تھے..

وہ جو اپنے اپنے جھنگ، دانا باد، گجرات کو لوٹ گئے تھے، پلٹ آئے اور اُس چکا چوند روشنی میں نمودار ہونے لگے..

جب پانیوں پر روشنی چھا گئی تو وہ اُس میں سے ظاہر ہونے لگے..

ہیر، صاحباں، سوہنی کے حُسن کے لشکارے اُس الوہی روشنی کو ماند کرنے لگے..

- میں جاناں جوگی دے نال..کنیں مُندراں پا کے متھے تِلک لگا کے..

- سوہنی گھڑے نُوں آکھدی۔اَج مینوں پار لنگھا گھڑیا

- دِھی کھیوے دی صاحباں.. .. .. ..

اُن پانچوں نے اُن تینوں کی راہ میں اپنے پَر بچھا دیئے..سرنگوں ہو گئے..وہ تینوں روشنی میں نہائے ہوئے، طورِ نُور میں شرابور ٹلہ جوگیاں کی ناہموار چڑھائی کو ڈھانپتی جھاڑیوں میں اُلجھتے ہوئے اترے اور پھر جیسے اذن ہوا، اُن کے بدنوں میں نئے احکام نازل ہوئے، کوئی خودکار نظام حرکت میں آیا کہ وہ خود بخود اُن پانچوں منتظر پرندوں کے سامنے اپنے پَر سمیٹ کر براجمان ہو گئے..

وہ تین اُن پانچوں کے روبرو ہو گئے..

وہ پانچوں جو ابھی مُوئے حسین سے التجائیں کرتے ،فریادیں کرتے غل مچاتے تھے ،چُپ ہو گئے.. گویا اُن کی چونچیں جکڑی گئی ہوں ،وہ جستجو ،عشق ،معرفت ، بے نیازی ،توحید ، حیرت اور فنا کی وادیوں میں اترتے جاتے تھے..

ایک دوسرے کو تکتے جاتے تھے.. آنکھیں تک نہ جھپکتے تھے..

اگر چہ یہ قاف کا وہ پہاڑ نہ تھا جو پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا، ہاتھی شکل کا ٹلہ جوگیاں تھا..

اُن میں سے کون تھا جو آج پھر فریدالدین عطار کے نیشا پور میں چلا آیا تھا، پھر سے سچ کی تلاش میں سر گرداں ہوا تھا..

وہ سب تو کب کے اپنے اپنے سچ پر یوں قائم ہو چکے تھے کہ اُس میں ذرہ بھر انحراف ممکن ہی نہ تھا تو انہیں جستجو کیا تھی...

اور وہ جو کائناتوں اور آسمانوں کی رنگین روشنیوں میں رنگے ہوئے تھے، چراغوں پر قدم رکھتے ، پانیوں پر تیرتی روشنی پر قدم رکھتے دوبارہ واپس آ گئے تھے ،لوٹ آئے تھے، تو کیوں لوٹ آئے تھے، وہ تو سچ کو پا چکے تھے..

وہ آٹھوں تو آسمان سے نازل ہوئے تھے..

اور یہ تینوں زمین میں سے پھوٹنے والے عشق کے مدھ بھرے بُوٹے تھے..

آمنے سامنے.. آٹھوں کے سامنے وہ تینوں چُپ بیٹھے تھے آمنے سامنے.. اور ان کی آنکھوں میں جستجو کے جگنو ٹمٹماتے تھے، عشق آتش بھڑکتی تھی، معرفت کی لَو ایک اگر بتی کی مانند سلگتی تھی ، بے نیازی کی ، بے اعتنائی کی بے رخی تھی ،توحید کی یکتائی کُن فیکون کہتی تھی ، حیرت کے جہان

اندر جہان تھے اور فنا کی فنا تاریکی کا بلیک ہول تھا، جس میں داخل ہونے والا اپنی کائنات میں لوٹ نہیں سکتا تھا، بلیک ہول کے خاتمے پر ایک اور کائنات کی ہمیشگی میں ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہی وہ سات وادیاں تھیں جنہیں پار کر کے وہ پانچوں یہاں تک پہنچے تھے..

وہ ایک دوسرے کو تکتے جاتے تھے..

کیا ہم ہی ہم ہیں؟

یا کیا تم ہی تم ہو؟

یا پھر ہم تم ہیں اور تم ہم ہو..

کیا ہم سب ایک ہی رُوپ کے مختلف رُوپ ہیں..

ہماری شکلیں اِک دوسرے کے ساتھ ملتی جُلتی کیوں جا رہی ہیں..

ہماری شباہتوں میں کچھ فرق دکھائی نہیں دے رہا..

تو کیا سچ ہماری شباہتوں اور شکلوں میں منتقل ہو کر انا الحق کی تفسیر ہو رہا ہے.. کون سا روپ آخری سچ ہے..

وہ آٹھوں چونچیں مقفل کیے چُپ تھے.. اور تب اس چُپ کے دوران بہت سے ماہ و سال یوُں سرسراتے ہوئے جھپ جھپ گزرنے لگے جیسے گرمیوں کی راتوں میں برفانی موسموں سے فرار ہونے والے پرندوں کی سرسراہٹ آسمانوں سے اتر کر کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے، اُن کی ڈاریں آسمان پر دکھائی نہیں دیتیں لیکن اُن کے پروں کی سنسناہٹ زمین کی چپ کے قفل کھولتی جاتی ہے..

وقت کے رہٹ کے کُوزے ان ساتوں وادیوں کے عمیق کنویں میں اتر کر اُس کے پانیوں سے لبریز ہو کر باہر آتے رہے، پانیوں کو وہ جو سچ کی تلاش میں پیاس کے مارے تھے، اُن کے حلق میں اتارتے رہے اور پھر وہ تھم گئے.. وقت کا رہٹ تھم گیا..

کرشن پرندہ ابھی تک سہا ہوا تھا اور اُس کے سامنے ہیر پرندہ شرمایا لجایا بیٹھا تھا کہ وہ بھی کسی کرشن کی کنیا تھی، بندرابن میں نہیں، چناب کے جنگل بیلے میں مُرلی بجاتے ایک ایسے کرشن کی گوپی تھی جو مکھن چُراتا نہیں تھا، مکھن سے اپنی لٹیں چوپڑتا تھا..

بُدھ کی ناتوانی کے عین سامنے سوہنی کا سوہنا رُوپ تھا، اُن دونوں کے درمیان پانیوں کا بندھن تھا، اُس نے پانیوں کے کناروں پر دُھونی رمائی اور وہ اُن میں ڈوب گئی..

جھلسے ہوئے پرندے کے رُوبہ رُو صاحباں کے نین سندھور بھرے تھے..

وہ تینوں پرندے، ہیر، سوہنی اور صاحباں پرندے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ بس وہی عشق کے سچ کا آخری رُوپ ہیں، بس اُنہی کی جلوہ گری ہے جو عشق کے تخت پر براجمان ہے جب اُن سب کو آسمان پر بین کرتی ایک سرگوشی سنائی دی.. اُن آٹھوں نے اپنی آنکھیں آسمانوں کی جانب اٹھا کر دیں پر وہاں کوئی نہ تھا، صرف کسی اور پرندے کی موجودگی کی سرسراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی..وہ جو گمان تھا، جیسے کوئی نیم بسمل تڑپتا ہے پر دکھائی نہیں دیتا اُس خلاء میں سے اُن پر ایک شعر نازل ہوا..

سطیر الحماء تکلفلفت ورق البہا تصفصفت　　دیک الضیاء تذو رفت متجملہ متجملہ

''عالمِ غیب کا پرندہ چہک اٹھا ہے، بہاء کے بلبل نے پر پھیلا دیئے ہیں، مرغ سحر نہایت جمال وجلال سے محوِ خرام ہو گیا ہے..''

اُس عالم غیب میں سے قرۃ العین طاہرہ کا پرندہ ظاہر ہوا جس کی سیاہ آنکھوں میں ایک اندھے کنویں کی تاریکی کا سُرمہ تھا اور اُس کے گلے میں ایک ریشمی رومال تھا جو اسے گھونٹتا تھا..

- طاہرہ بردار پردہ از میان تا بیاید سرِ غیبی درعیان

''طاہرہ، اب درمیان میں سے پردہ اٹھا ہی دو کہ غیب کا راز عیاں ہو جائے۔''

طاہرہ روپوشی کا پردہ اٹھا کر اُن آنکھوں کے سامنے عیاں ہو گئی۔۔وہ تینوں ہیر، سوہنی اور صاحباں پرندے پکار اٹھے کہ اے طاہرہ بس تو ہی عشق کی معراج ہے۔۔ہم تینوں تو تیری باندیاں تیرے نقش قدم پر چلنے والی چڑیاں ہیں، پرندہ تو ہی تُو ہے۔۔جیسے تُو بہا اللہ کے عشق میں فنا ہوئی ہم بھی اپنے اپنے رانجھے، مہینوال اور مرزے کے لیے مر مٹیں پر ہمارے اندر اظہار کی وہ شعری آگ نہ تھی کہ اپنے دل کی حالتیں بیان کر سکتیں۔۔دوسروں نے وارث شاہ، حافظ برخوردار اور۔۔۔۔نے اپنے اپنے رنگ میں ہمارے عشق کی کہانیاں لکھیں۔۔لیکن انہوں نے ہماری نہیں اپنے دل پر گزرنے والی وارداتوں کی داستانیں بیان کیں، ہمیں تو بہانہ کیا۔تم ہم سب پر اس لیے سبقت رکھتی ہو کہ تم پہ جو گزری وہ تم نے اپنے ہی خون میں اُنگلیاں ڈبو کر رقم کیا۔۔۔تو اے طاہرہ۔۔تُو عشق اور بیان میں ہم سے افضل اور برتر ہے۔۔ہم سے بات کر۔۔

طاہرہ پرندے نے آسمانوں سے اتر کر زمین پر اپنے پنجے جمائے، اس توصیف سے ماورا صاحباں کے سامنے بیٹھے ہوئے طُوری جھلسے ہوئے پرندے کو متوجہ کیا اور مخاطب ہوئی ''تیرے عشق میں ایک آنچ کی کمی رہ گئی۔۔ طُور کی جلتی ہوئی جھاڑی کے سامنے اُس مقدس زمین پر تو جوتیوں سمیت ہی چلا جاتا اگر تجھے ڈانٹ نہ پڑتی۔۔تُو بے شک سجدہ ریز ہو گیا پر تیرے عشق میں انتہا نہ تھی، اگر ہوتی تو اپنے آپ کو اُس جھاڑی کی آگ کے سُپرد کر دیتا، اپنے آپ کو اپنے محبوب میں مدغم کر کے اُس کی راکھ ہو جاتا۔۔جیسے میں ہو گئی۔۔تُو اپنے سینے پر اپنی ہتھیلی جماتا تو تیرا ہاتھ ید بیضا کے نور سے دمکنے لگتا پھر بھی تُو اُس سے دور رہا۔۔دیکھ جب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتی تھی تو میرا ہاتھ بھی بہاء

اللہ کے عشق کی آتش سے روشن ہو جاتا تھا..

ٹو نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سپرد ہی نہ کیا..

میں نے تو کر دیا..

تو جس طور پر گیا وہ میرے ہی دل کی چوٹی تھی جس پر ایک جھاڑی یعنی میں جلتی تھی..

چہ شود کہ آتشِ حیرتی زنیم بقلۂ طورِ دل
فسکلکۃ و کلکۃ متدکد کا متزلزلا

"کیا ہی اچھا ہو اگر تو میرے طورِ دل کی چوٹی پر آتش حیرت میں ڈال دے پھر اس پہاڑ کو جھنجھوڑ کر اور ہلا کر ہموار کر دے.."

طُور کے جلوؤں سے جھلسا ہوا پرندہ گنگ ہو گیا..البتہ وہ بھی طاہرہ پرندے کے حسن بے مثال کی شعاعوں کی زد میں آ کر مزید جھلس گیا..جس کے حسن کا اسیر ایک شہنشاہ ہوا اور اُسے اپنے نکاح میں لانے کی درخواست کی جو ٹھکرائی گئی..

تو ملک و جاہِ سکندری، من و رسم وراہِ قلندری اگر آن نیکوست تو درخوری، وگر ایں بد است مرا سزا

(ایک تو ہے کہ تیرا مقدر سکندر اعظم کا سا ملک و جاہ ہے..ایک میں ہوں کہ میرا نصیب درویشانہ رسم وراہ ہے..اگر وہ اچھا ہے تو تجھے مبارک ہو اور اگر یہ برا ہے تو میں اس کی سزاوار ہوں)..

صرف جھلسا ہوا پرندہ ہی نہیں باقی سب کے سب بھی اپنی چونچیں پروں میں پوشیدہ کیے چُپ بیٹھے تھے..

طاہرہ پرندہ بھی ایک ہریل طوطے کی مانند گلے میں ایک سرخ رومال کی مالا ڈالے چُپ میں چلا گیا. تب وہ جس اندھے کنویں میں گلا گھونٹ کر ڈالا گیا تھا، اُس میں نُور کا ایک دیپ جلا جس کی روشنی میں حرا کے شگافوں میں سے داخل ہونے والی چاندنی کے جزیروں میں نہایا ہوا وہ پرندہ اُسے دکھائی دیا جو پَر سمیٹے اُن سب سے لاتعلق ہوا جاتا تھا.. طاہرہ پرندے میں ایک جھجک تھی اُس کے روبہ رو ہونے اُس کے چہرہ بہ چہرہ ہونے میں کہ وہ روگردانی کا مرتکب ہوا تھا، شرمندگی نہ تھی محض جھجک تھی تو وہ نہایت مؤدب ہو کر اُس کے حضور پیش ہوا اور ان الزامات کی توجیہہ پیش کرنے لگا جو اُس پر نہ صرف اُس کے خاوند اور باپ نے بلکہ پورے معاشرے نے لگا کر اُسے مطعون کیا تھا..

''دیکھ میں نے انحراف نہیں کیا.. تجھ سے اور تیری کتاب سے منحرف نہیں ہوئی، تیری شریعت کو رد نہیں کیا.. میں باندی تیری ہی تھی لیکن بہا اللہ کے عشق میں بندھ گئی کہ اُن میں میں نے تیرے روپ کا جمال دیکھا.. تیرا جمال تیرے خاک بسر ہونے سے تو فنا نہ ہوا، وہ منتقل ہوتا رہا.. تو میں اگر بہا اللہ پر ایمان لے آئی تو وہ مجھے تیرے تسلسل کا ہی ایک روپ دکھائی دیا.. میں تو جان لے کہ تیری اونٹنی قصویٰ کے پاؤں میں بندھی جھانجھروں کا ایک گھنگھرو ہوں، قصویٰ کے پاؤں تلے آنے والی ریت کے ہر ذرّے میں، میں نے اپنا دل باندھا، اُس کے محوِ خرام ہونے سے جو دُھول اٹھتی تھی، اُس دھول کے ہر ذرّے میں، میں نے اپنا دل باندھا.. میں نے تیرے پھٹے پرانے جوتوں میں اُن گانٹھوں میں اپنا دل باندھا جو تو نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں اور دل کے ساتھ اپنے ہونٹ باندھے.. اے غارحرا کے باسی پرندے طاہرہ تیری اڑان پہ قربان، تیرے جمال پر صدقے واریاں.. میں انحراف کی مرتکب نہ ہوئی، تو اپنے دین کے بیوپاریوں کے فتوؤں پہ نہ جانا کہ اُن کے

دل عقیدے کی سختی، رعونت اور تکبر سے پتھر ہو چکے ہیں.. میں نے اگر بہاء اللہ کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کیا تو گویا تیرے لیے ہی فنا ہوئی کہ اس کائنات میں جو بھی عشق کے اس عارضے میں مبتلا ہوتا ہے اُس کی ڈور تجھ سے ہی بندھی ہوتی ہے.. تو ہی طبیب ہے، تو ہی حبیب ہے..''

حرا کے پرندے نے طاہرہ کو نظر بھر کر دیکھا اور دیکھا کہ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام.. اُس کے چہرے پر اُسی کے جلوے تھے.. دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام.. طاہرہ بھی دہکتی تھی اُسی گُل کی آتش سے، عشق آتش سے، جس نے اُسے جلا کر راکھ کر دیا تھا..

''تو ہی طبیب ہے، تُو ہی حبیب ہے'' طاہرہ نے دوہرایا اور اپنے پَر سمیٹ لیے، جو کہنا تھا کہہ دیا.. وہ اُن آٹھوں کی خاموشی میں شریک ہو کر چُپ کے جہان میں اتر گئی..

ایک بار پھر پورے ٹلّہ جوگیاں پر چُپ کی چاپ چُپ ہو گئی..

ہوا بھی نہ تھی کہ اُس کی سرسراہٹ سنائی دیتی.. سانس بھی سب کے جیسے رُک چکے تھے، یہاں تک کہ سناٹے کی بھی جو مدھم سائیں سائیں ہوتی ہے، وہ بھی تھم چکی تھی..

جب مدتوں وہ یوں آمنے سامنے بیٹھے چُپ کی چادر اوڑھے گم سم بیٹھے رہے، جیسے حنوط ہو چکے ہوں تو مُوسئے حسین کو وحشت ہونے لگی..

وہ کن بکھیڑوں میں اُلجھ گیا تھا..

جوگی بالناتھ اور جوگی گورکھ ناتھ کے گورکھ دھندوں میں الجھ گیا تھا..

یونہی ایک تجسّس کی خاطر، پورس کے ہاتھی کے شانے پر سوار، بابر اور اکبر کی تُرک تمکنت کی تیموری سلطنت کی یاد میں، پُورن پر فدا ہو جانے والی رانی سُندراں کے سُندر سُندر راپے کی مہک میں، ہری بھرتری، بابا نانک اور رانجھے کے راستوں پر چلنے کے لیے محض ایک تجسّس کے ہاتھوں لاچار ہو کر اس ٹلے پر چڑھنے کا قصد کر بیٹھا تھا، کس بکھیڑے میں پڑ گیا تھا.. اُس میں اب تو دم نہ تھا، جو دم آتا تھا دم

آخر کی مانند گلے میں خرخراہٹ کا ایک گھنگھرو کھنکاتا تھا اور ستم یہ کہ یہ پورے نو پرندے جن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں اُن قدیم انگوروں کا خمار تھا، جن کی ایک بیل حضرت نوح نے طوفان تھمنے پر، سیلاب اترنے پر زمین پر قدم رکھنے کے بعد خشکی پر کاشت کی تھی..اُن کی پھڑ پھڑاہٹ سے نشہ ہو جاتا تھا اور وہ کب کے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے، رو بہ رو، چہرہ بہ چہرہ بیٹھے چُپ بیٹھے تھے..وہ اُن کی چُپ خاموشی سے تنگ آ گیا..

''کیوں یونہی بیکار بیٹھے میرے حواس پر سوار ہوئے جاتے ہو یا تو کسی آخری نتیجے پر پہنچ جاؤ کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے اور یا پھر..رخصت ہو جاؤ، اڑان کر جاؤ، مجھے یوں پریشان نہ کرو..اپنے اپنے سچ کی ڈولی میں سوار ہو کر رخصت ہو جاؤ، میرا راستہ کھوٹا نہ کرو..''

''ہم تم سے ناراض ہیں..'' طاہرہ کے سوا بقیہ سب پرندوں نے اپنی چُپ توڑ کر پر پھڑ پھڑائے ''تم نے ہماری قدر نہ کی..لو ہم رخصت ہوتے ہیں..'' اور انہوں نے اپنے پَر پھیلائے، انہیں ہوا کے زور سے توازن کیا اور اڑان کر گئے..

مُوسے حسین نے ان کی رخصتی پر اطمینان کا ایک گہرا سانس بھرا لیکن یہ طاہرہ پرندہ تھا جو پَر سمیٹے بیٹھا رہا، رخصت نہ ہوا..

''تم کیوں اپنی پرواز سے غافل ہو گئے ہو..جاتے کیوں نہیں؟''

''میں معلوم کی سرحدوں سے پرے نامعلوم کی وادیوں میں ہوں، موجود بھی ہوں اور ناموجود بھی..دکھائی دیتا ہوں اور اوجھل بھی ہوں کہ عشق موجود حق موجود..میں بھی جا چکا ہوں، یہ صرف میرا عکس سراب ہے جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے..میں کب کا رخصت ہو چکا..''

اور واقعی..وہ ابھی نظر آ رہا تھا اور ابھی غائب کی وادی میں گم ہو گیا تھا..

■•◆•◆•◆•■

ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر وہ قدم رکھ چکا تھا لیکن کیا یہی اُس کی پہاڑی مسافتوں کی معراج تھا..

وہاں اُس کی آخری بلندی پر زمانوں سے ماورا جو آپرا کھیل سٹیج ہو رہا تھا، جو ہو چکا تھا، جو ہونے والا تھا، وہ اُس آپرا میں حصہ لینے والے سب اداکاروں، کرداروں سے آگاہ ہو چکا تھا، ان سے کلام کر چکا تھا..اُن کی قربت محسوس کر چکا تھا..منطق الطیر نام کے آپرا کھیل میں حصہ لینے والے جتنے بھی رُوپ بہروپ تھے اُن سے ملاقات کر چکا تھا...تو پھر لاحاصل..آخری بلندی پر قدم رکھنا، لاحاصل!

آپرا منطق الطیر

کردار..

The HOOPOE	ہُدہُد
The RINGDOVE	قمری
The PARROT	طوطا
The PATRIDGE	تیتر
The FALCON	شہباز

The FRANCOLIN	درّاج
The NIGHTINGALE	بلبل
The PEACOK	مور
The PHEASENT	چکور
The PIGEON	کبوتر
The TURTLEDOVE	فاختہ
The HAWK	عقاب
The GOLDFISH	سنہری مچھلی

منظر جو کُھلتا ہے

اے ہُد ہُد.. خوش آمدید..

شاہ سلیمان، جو پرندوں کی بولیاں بولتا تھا..

اُس نے تیرے سر پر کلغی کا تاج اعزاز رکھا..

تمہیں ملکہ سبا کے لیے اپنا خفیہ پیغامبر کیا..

اے قُمری

تو کوہِ سینا پر گھونسلا بنائے بیٹھی تھی

اور تم نے، مُوسےٰ کی مانند اُس آگ کا دُور سے نظارہ کیا

اے طوطے..

خوش آمدید.. تو جنّت کے ایک شجر میں قیام کرتا ہے

ایک الوہی پیراہن اوڑھے ہوئے

اور تیرے گلے میں شعلے کی مانند ایک گلوبند آویزاں ہے

تیتر

''تو جو دانش کے کوہ سے شان سے اترتا ہے..

اپنی انا کی پہاڑی کو برباد کر دو..تا کہ ایک حاملہ اونٹنی ایک چٹان میں سے پُھوٹ پڑے..

شہباز

وحدانیت کی غار میں قیام کرو..

اور تب وہ جو رحمتِ دو جہاں ہے..

تم سے ملاقات کے لیے آئے گا..

درّاج

تم جنت کے آسمانوں کے پرندے ہو..

جس نے محمدؐ کو ابدیت کا تاج پہنے دیکھا

اپنی انا کو فنا کر دو..

بُلبل

خوش آمدید، محبت کے باغوں میں بسیرا کرنے والی

جو عشق کی اذیت سے آنسو بہاتی ہے

مور

جی آیاں اے مور جی..

تو جو جنت کے آٹھ دروازوں والے چمن میں قیام کرتا ہے
اور تم تھے جسے سات سروں والے سانپ نے
ڈس لیا تھا..

چکور

تم ایک خشک ہو چکے اندھے کنویں میں قید ہو..
(کیا تم بھی ایک طاہرہ ہو؟)
اس تاریک گہرائی میں سے پرواز کرتے نکل جاؤ
اور اپنے محبوب کے آسمان تک اڑتے چلے جاؤ

کبوتر

جاؤ اور انا کی مچھلی کا سر کچل دو..
اور پھر اڑتے ہوئے چاند کا چہرہ چوم لو..

فاختہ

داخل ہو جاؤ..
اور دانش تمہیں راستہ دکھائے گی
اور تمہارے بدن میں آگہی جنم لے گی

عقاب

تم جو آسمانوں کو چیرتے ہوئے پرواز کرتے ہو..
پلٹتے اور جھپٹتے ہو..
انحراف نہ کرنا ورنہ گر جاؤ گے..

اپنی انا کو فنا کردو

سنہری مچھلی

ایک آگ کی مانند داخل ہو جاؤ..

ہر اُس شے کو جلا کر راکھ کر دو، جو تمہارے راستے میں آتی ہے..

اپنے محبوب کے راستے کا ایک پرندہ ہو جاؤ..

فنا ہو جاؤ، یہاں تک کہ تم بھی اپنے محبوب کی شکل اختیار کر لو..

منطق الطیر کا آپرا کھیلا جا رہا ہے.. سب پرندے انا کے تکبر میں مبتلا اور بیمار، اپنے اپنے حسن کے طلسم میں گرفتار، اپنے عشق میں مبتلا، اپنے بادشاہ سی مُرغ کی تلاش میں نکلنے سے گریز کرتے ہیں، بہانے تلاش کرتے ہیں اور ہُد ہُد جو خود سلمان کے ڈاکیہ ہونے پر نازاں ہے، جو سبا تک اُس کے عشق کے مراسلے پہنچاتا ہے، انہیں سچ کی تلاش میں، سات وادیاں عبور کر کے کوہ قاف تک اڑانیں کرنے کے لیے قائل کر لیتا ہے..

تو پھر لا حاصل، آخری بلندی پر قدم دھرنا لا حاصل.. کہ.. منطق الطیر جدید کے جتنے بھی اداکار پرندے تھے وہ اُن سب سے کلام کر چکا.. انہوں نے اُس کے سامنے وہ آپرا کھیل پیش کیا جو ایک ہزار برس پیشتر فرید الدین عطار کے نیشاپور کے سٹیج پر کھیلا گیا..

تو اے مُوئے حسین، تیری تلاش تمام ہوئی..

جستجو کے دریاؤں کے سب پانی تو نے گھونٹ گھونٹ بھر لیے..

اس سے پیشتر کہ تیری سکت دم توڑ دے، تو اپنی تھکاوٹوں اور ہڈیوں کے کڑ کنے اور دم رُکنے سے، پھیپھڑوں کے ڈھے جانے اور دل کی جانب جو خون اگرچہ ست روی سے رواں ہے تو

اُس کے راستے میں کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے اور تیرا یہ دل تھم جاتا ہے تو اے مُوسے تو وہ مُوسے تو نہیں جس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ تُو بنی اسرائیل کو سرزمین مصر سے لے جا اور وہاں تمہارے لیے ایک اور سرزمین سرسبز اور زرخیز ہوگی اور یہ وعدہ پورا ہوگا۔ تیرے ساتھ تو کوئی وعدہ نہیں کیا گیا، تو تنہا ہے تو اگر یوں کسی قبیلے کے بغیر یہاں ٹلّہ جوگیاں کی ویرانیوں میں دم توڑتا ہے، موت کا ذائقہ چکھتا ہے تو کیا تجھے قلق نہ ہوگا.. بہت ہو چکی.. جو اُن دیکھا تھا، وہ دیکھا جا چکا، جو نا معلوم تھا معلوم ہو چکا، جو پوشیدہ تھا، تجھ پر ظاہر ہو چکا تو لوٹ جا..

اور جونہی وہ لوٹ جانے کو تھا، واپسی کی راہ اختیار کرنے کو تھا، ٹلّہ جوگیاں کی سنگلاخ چٹانوں میں دراڑیں نمودار ہونے لگیں، اور ان دراڑوں میں سے اُس مُوسے سے جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ پورا ہوا اور ان میں سے بارہ چشموں کے پانی پھوٹ پڑے..وہ بھی زمزم نہ تھے ٹھہرے نہیں، بہنے لگے.. اُس کے پژمردہ بدن کی نس نس میں آبی آفتابوں کی مانند طلوع ہونے لگے..رگوں اور شریانوں میں جو لہو تھم تھم کر چلتا تھا اُس میں شامل ہو کر ایک پہاڑی ندی کی طرح شرلاٹے بھرتے بہنے لگے اور اُس کا دل جو تھم تھم کے چلتا تھا، وہ اُن کے زور سے یوں نہال اور خوش ہوا کہ تھمنے کے سب ارادے ترک کر کے زندگی زندگی الاپتا دھک دھک کرتا گُونجنے لگا..ان بارہ چشموں کے پانی اُسے دھکیلتے ہوئے آگے لے گئے..

ایک اور قدم اٹھایا اور وہ قدم ٹلّہ جوگیاں کی آخری بلندی پر ثبت ہوا..اُس کا قدم اُس زمین پر پڑا تو اُس میں سے ایک ایسی دھمک کی دھم نے جنم لیا کہ ہر شے لرزش میں آ گئی، وہ خود بھی لرز گیا کہ آخر صرف ایک قدم دھرنے سے اتنا شور کیوں بپا ہوا ہے..اُس نے اگلا قدم اٹھانے سے گریز کیا، وہاں ٹلّہ جوگیاں کی چوٹی کے بے آب و گیاہ منظر میں جتنے بھی کھنڈر آثار تھے اُن پر ایک ایسی

خاموشی اتری ہوئی تھی کہ اگر اُن پر کوئی تتلی بھی پَر پھڑ پھڑاتی اترتی تو وہ اس سکوت کو جو چاروں اور طاری تھا، ریزہ ریزہ کر دیتی، خاموشی ایسی تھی..وہ سانس بھی آہستہ لیتا تھا کہ خاموشی کی شیشہ گری کا کام بہت نازک تھا..

یہ خاموشی کچھ نئی نہ تھی، جب پانیوں پر دھند ٹھہری ہوئی تھی اور ہر سو تاریکی تھی تو یہی خاموشی روشنی ہو جانے سے پیشتر ہر سُو راج کرتی تھی..

بدھ کی فاقہ زدہ پسلیوں کے بھیتر میں یہی خاموشی بسرام کرتی تھی..سلگتی جھاڑی کی جلتی ہوئی ٹہنیاں چپ چپ جلتی جاتی تھیں، بے آواز، کڑکتی نہ تھیں، لب بستہ تھیں..

صلیب پر کھنچے ہوئے ابن مریم کے لبوں پر بھی، صرف اُس فریاد کے بعد کہ..

اے رب تو نے مجھے کیوں فراموش کر دیا، خاموشی تھی..

غار حرا کے ہر شگاف میں بھی خاموشی بسیرا کرتی تھی..

بندرابن کے جنگل کا ہر شجر سکوت میں حنوط چُپ تھا..

بلخ کے آتش کدے کی آگ بجھی ہوئی تھی، کنویں کی تہہ میں طاہرہ شکایت نہ کرتی چپ تھی، انا الحق لبوں پر نہ آتا تھا..سکوت تھا..

آسمانوں سے جو کچھ اترتا ہے، نازل ہوتا ہے وہ ایسی ہی خاموشیوں پر خاموشی سے اترتا ہے..

جیسے ماہر آثار قدیمہ کارٹر نوجوان فرعون ٹوٹن خامن کے ہزاروں برسوں سے مقفل مقبرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ دنیا کی سب سے قدیم خاموشی میں مُخل ہوا ہے، ایسے ہی مُوسے کو احساس ہوا کہ وہ بھی مُخل ہوا ہے..لے سانس بھی آہستہ..

کھنڈروں کے آغاز میں جنگلی زیتون کا ایک اپاہج لگتا ٹیڑھا میڑھا شجر اُن کی قدامت کی

کائی زدہ اینٹوں پر جھکا ہوا تھا.. زیتون کے اس درخت کا پتہ پتہ ٹلّہ جوگیاں پر گزرے ہوئے زمانوں کا حال جانے تھا.. ہر پتے پر پچھلے سوا دو ہزار برس سے اس کی چوٹی پر پہنچنے والوں اور وہاں بسرام کرنے والے جوگیوں، سنت سادھوؤں، شہنشاہوں، شہزادوں، شاعروں اور عاشقوں کے نقش فریادی تھے.. کچھ خاک نشینوں کی ڈھیریاں تھیں جن میں جانے کن وقتوں کے کون کب کے مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے تھے.. اور وہ جو اپنے عقیدے کے مطابق آگ کے سپرد ہوئے جانے کتنے بے انت تھے ان کی راکھ کا کوئی ذرہ بھی باقی نہ تھا، مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے..

جنگلی زیتون کے سائے میں ایک کب کا خشک ہو چکا کائی زدہ تالاب تھا، البتہ اُس کے ایک کونے میں بارشوں کا کچھ گدلا پانی ٹھہرا ہوا تھا.. مذہب اور عقیدے سے ماورا اکبر اعظم نے جب جوگیوں سے پوچھا کہ میں تمہاری سیوا کے لیے کیا کروں تو انہوں نے کہا، ہم بالناتھ کے چیلے کب کے دنیا تیاگ چکے.. پر یہ بدن تیاگا نہیں جاسکتا، اس کی کچھ مانگیں ہیں، ہم گائیاں پال کر اُن کا دودھ فروخت کرتے ہیں، ٹلّے پر اپنے گزارے جوگی سبزیاں کاشت کرتے ہیں پر ہمارے پاس پانی نہیں ہے، بہت نیچے جو ندی بہتی ہے اُس میں سے ڈول بھر بھر کر اوپر لاتے ہیں پھر بھی پیاسے رہتے ہیں، مر جاتے ہیں تو ہمیں پانیوں کا ایک تالاب درکار ہے.. تو اکبر نے جوگیوں کی اچھیا پوری کر دی، ایک پُرشکوہ تالاب تعمیر کر دیا.. ٹلّے کی چٹانوں کی دراڑوں میں سے جو چشمے پوشیدہ تھے ان کا رخ اس تالاب کی جانب موڑ دیا.. بارشوں کے موسم میں پانی تالاب کے کناروں سے باہر آجاتے..

وہ گئے زمانے تھے..

کائی زدہ سیڑھیاں تالاب میں بے تحاشا اُگنے والے سرکنڈوں اور بُوٹیوں میں اترتی تھیں، جس کے ایک کونے میں گدلے پانیوں کا ایک ذخیرہ تھا.. جس پر باریک مچھروں کی ایک گُتّی

بھنبھناتی منڈلاتی تھی..

اُن آلودہ پانیوں میں، مُوسٰے نے دیکھا، وقفے وقفے کے ساتھ کوئی ایک چونچ ڈوبتی ہے، وہ چونچ دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ ڈوبتی ہوئی سنائی یوں دیتی تھی کہ اُس ازل خاموشی میں ایک آبی ارتعاش کانوں میں اترتا تھا.. گدلے پانیوں کی سطح پر کسی چونچ کے ڈوبنے سے ایک لہر در لہر دائرہ پھیلتا اور پھر وہ پانی ہموار ہو جاتے.. چونچوں کے ڈباؤ کی سرسراہٹ کے سوا خاموشی کی اُس بے انت چُپ کی چادر کے بھیتر میں ایک مدھم سی پھڑ پھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی..

تالاب کی آخری کائی زدہ سیڑھی پر براجمان ایک خاموش جھرمٹ تھا قطار باندھے.. وہی آٹھ پرندے تھے.. جن میں سے کوئی ایک اپنی گردن میں بل دے کر گدلے پانیوں پر جھک کر اُن میں اپنی چونچ ڈبوتا اور پھر سیدھا ہو کر اپنے غول میں لوٹ آتا..

وہ سب پرندے جو اُس سے ہم کلام ہوئے تھے وہاں موجود تھے.. مُوسٰے حسین مدھم دبے پاؤں تالاب کی سیڑھیاں اترا کہ کہیں اُس کی آہٹ سے ہراساں ہو کر وہ اڑ نہ جائیں.. اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ پرندے اڑنے والے نہ تھے.. وہ سب وہاں تھے جہاں اپنی خبر بھی نہیں آتی، اتنے بے خبر تھے.. آس پاس کوئی آتش فشاں پھٹ پڑتا تو بھی اُنہیں خبر نہ ہوتی کہ وہ سب مَیالے پانیوں پر جھکے اپنی شکل شباہت پہچاننے کے آرزومند تھے اور وہ دِکھتی نہ تھی، آئینہ شفاف نہ تھا، گدلا تھا..

وہ وقفے وقفے سے پانیوں میں پانی چونچیں اس لیے ڈبوتے تھے کہ پانی شاید نکھر جائیں، اُنہیں اپنی شکل نظر آ جائے.. کچھ تو سراغ ملے کہ سچ کیا ہے، اگر وہ قاف کے پہاڑ سے انحراف کر کے اس ٹیلے پر آ نکلے تھے کہ وہ اُس سچ کے قائل نہ ہوئے تھے، نیشاپور سے منہ موڑ کر ادھر اڑان کر آئے تھے تو پانیوں پر اُن کی صورت نقش کیوں دکھائی نہیں دے رہی..

نابینا پانیوں کے ایک مختصر جوہڑ کی سطح پر اُنہیں اپنی صورت دکھائی نہ دیتی تھی تو کیا یہ طویل

سفر لا حاصل تھا..

اتنی صدیوں کے بعد ٹلہ جوگیاں کے تالاب کے گرد اُن سب پرندوں کا اجتماع ہوا تھا جو کبھی قاف کے پہاڑ کے پردے کے پیچھے، اُس پردے کے اٹھنے کے منتظر تھے اور جب پردہ اٹھا تو وہ خود ہی روبہ رو تھے، خود ہی سچ تھے، وحدت الوجود تھے.. وہ ایک نئے سچ کی تلاش میں چونچیں جھکائے بیٹھے تھے، کیا جانئے آج سچ کی شکل کچھ اور ہو گئی ہو.. کیا پتہ جو کچھ آج تک آسمانوں سے اترا تھا اُس کی ہو بہو پیروی کرنا ان نئے زمانوں میں ممکن نہ رہا ہو.. اگر انسان بتدریج ارتقاء کی منازل طے کرتا آج تک پہنچا ہے تو کیا ایک نئے سچ کے لیے آسمانوں کی جانب دیکھنا جائز ہے کہ نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں نئے صحیفے ترتیب دیئے جا رہے ہوں جو اِن زمانوں سے مطابقت رکھتے ہوں جن کی غیر ضروری توجیہہ نہ کرنی پڑے..

وہ سب پرندے اُنہی صحیفوں کی شکلوں کے عکس پانیوں پر تلاش کرتے تقریباً حنوط شدہ حالت میں بیٹھے تھے، صرف اُن کی چونچیں تھیں جو اُن کے بقیہ بدن کی حنوطگی سے جدا ہو کر حرکت میں آتیں اور وقفوں وقفوں سے پانیوں میں ڈوب جاتیں..

ٹلہ جوگیاں کے اُس کائی زدہ تالاب کے کناروں پر منطق الطیر کا دوسرا اجتماع ہو رہا تھا..

وہ دبے پاؤں اترا کہ کہیں وہ اُس کی آہٹ سے ٹھٹک کر اڑ نہ جائیں، پر وہ تو حنوط ہو چکے تھے، آہٹوں سے بے خبر، جستجو، عشق، معرفت، بے نیازی، توحید، حیرت اور فنا کی وادیوں کے سفر کی دھول سے اٹے، انہیں کیسے خبر ہوتی کہ وہ جو انہیں راستے میں ملا تھا، جسے انہوں نے اپنا رازداں بنا کر دل کے سب بھید ظاہر کر دیئے تھے، وہ تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا چلا آیا ہے اور چپکے سے اُن کے پہلو میں پنجوں کے بل بیٹھ کر اُنہی گدلے پانیوں کو تکنے لگا ہے جن پر اُن

پرندوں کی نشیلی آنکھیں ٹھہری ہوئی ہیں..

نہ دوپہر اتری، نہ دن ڈھلا، نہ شام آئی، نہ رات وارد ہوئی، نہ چاند بابا نانک کی جائے گاہ کے باہر پانچ چراغوں کے جو پانچ طاقچے تھے، اُن میں ابھرا.. نہ ہی تالاب کے گرد گھنے الجھے ہوئے سرکنڈوں میں سے سورج طلوع ہوا.. جیسے وہ آٹھ پرندے اور اُن کے برابر میں ایڑھیوں کے بل بیٹھا ہوا مُوسٰے بھی حنوط ہو چکے تھے، ایسے سب زمانے اور موسم بھی ٹھہر گئے.. گدلے پانیوں پر باریک مچھروں کا جو مختصر سیاہ بادل حرکت کرتا تھا، وہ بھی معلق ہو گیا..

صدیوں کی گزران کا کیا حساب، زمانوں اور سیاروں کی گردش کی پیمائش کون کرے.. کون وہ فاصلے ماپے جو نامعلوم کائناتوں میں روشن کسی ستارے کی روشنی طے کرتی ابھی تک زمین تک نہ پہنچی تھی.. وہ آٹھ پرندے اور مُوسٰے تالاب کی آخری سیڑھی پر پہلو بہ پہلو براجمان گدلے پانیوں پر آنکھیں بچھائے، نظریں جمائے زمانوں اور سیاروں کی گردش سے ماورا بیٹھے رہے..

ارتکاز کی یکسوئی یک نظری اور یکتائی معجزوں کو جنم دے سکتی ہے.. اگر نظر مرکوز ہو جائے موم بتی کے شعلے پر، کسی شے یا شکل پر یا گدلے پانیوں پر، کائناتوں کی گردش اور زمانوں کی گزران سے ماورا ہو کر تو بالآخر موم بتی کے اُس شعلے میں عرش منور نظر آنے لگتے ہیں، ہر شے اپنی ہیئت کی تکمیل کی منزلوں تک پہنچ جاتی ہے، ہر شکل کی زیبائی میں اُس کی شکل ہی عکس ہوتی دکھائی دیتی ہے اور گدلے پانی بھی اُس ارتکاز کے معجزے سے یوں نتھر جاتے ہیں، شفاف آئینے ایسے ہو جاتے ہیں کہ اگر اُن پر کوئی ایک تنکا بھی گر جاوے تو وہ اُس کا بوجھ بھی نہ سہار سکیں اور کرچی کرچی ہو جاویں.. اُن پر جھکی ہوئی سب صورتیں تصویر ہو جاویں.. اور ایسا ہی ہوا..

اور کون ہے آئینوں میں، بس تُو ہی تُو ہے..

گدلے پانیوں پر معلّق باریک مچھروں کا بادل بھی حرکت میں آ گیا، وہ پانی جو ابھی اندھے تھے، دیکھنے لگے..اور وہ جو اُنہیں دیکھتے تھے، اُنہیں دیکھنے لگے..

آئینہ در آئینہ..اُن آٹھوں پرندوں کے عکس اور مُوسٹے کی شباہت پانیوں پر یوں نقش دکھائی دینے لگی کہ وہ سب مخمصے میں پڑ گئے...کیا یہ ہم ہیں جو پانیوں پر عکس ہوتے ہیں یا ہم دراصل پانیوں پر نقش ہیں اور تالاب کے کناروں پر تصویر بنے بیٹھے ہیں...

پانی جب آئینہ ہوئے تو پرندوں نے اپنے سچ کو اُن پانیوں پر عکس دیکھا..بندرابن کے جنگل ہرے ہوتے دیکھے، ایک چنگھاڑتے ہوئے مست ہاتھی کو دیکھا جس کے ماتھے پر مہاتما ہتھیلی رکھتا ہے تو وہ سرنگوں ہو جاتا ہے..اُن پانیوں پر جن میں طُور کی جھاڑی کی آگ روشن ہو رہی تھی...اُن پر ابن مریم چلتا جاتا تھا..غار حرا کے شگافوں میں سے داخل ہونے والی چاندنی کے جزیرے اُن شیشہ پانیوں کے درمیان ابھرتے تھے اور ہر جزیرے میں ایک پنچھی ''اقرأ اقرأ'' کُوکتا تھا..بلخ کے بُجھ چکے آتش کدے روشن ہوئے جاتے تھے، طاہرہ رو بہ رو چہرہ بہ چہرہ تھی اور حلاج کی راکھ فرات کے پانیوں پر تیرتی تھی..اُن سے کچھ فاصلے پر الگ بیٹھے وہ جو تین عشق پکھیرو تھے وہ اُس عشق کو تصویر دیکھتے تھے جو اُن سے رُوٹھ گیا..

ہیر اپنے اُس رانجھے کو پانیوں پر نقش دیکھتی تھی جس نے اُس کی خاطر، یہیں کہیں، آس پاس، شاید اسی تالاب کے کنارے اپنے کان پھڑوا کر، ماتھے تلک لگا کے، مُندراں پہن کر جوگ اختیار کر لیا تھا..اگرچہ جوگی بالناتھ نے اُسے خبردار کیا تھا کہ جاٹ کبھی بھی فقیر نہیں ہو سکتے، وہ اپنی انا کے تکبر میں بھیک نہیں مانگ سکتے اور تمہیں کشکول دراز کرنا ہوگا، آبادیوں میں جا کر بھیک مانگنی ہوگی..جوگی جتی ستی ہوتا ہے، اُس کے لیے عورت حرام ہے...لیکن جوگی کیا کرے جب ہیر کی

چوکھٹ پر صدا دیتے ہوئے وہ کہتی ہے..

؎ میں جاناں جوگی دے نال

صاحباں اُن پانیوں میں اپنے مرزے کو اپنے بھائیوں کے تیروں سے چھلنی جنڈ کے شجر تلے گھائل ہو چکے مرزے کو دیکھتی ہے..

؎ بُرا کیتا ای صاحباں.. میرا ترکش ٹنگیا جنڈ

سوہنی کے لیے وہ شفاف تالاب چناب تھا جس میں وہ ڈوب ڈوب جاتی تھی..

تینوں پرندے اپنی ناتمام حسرتوں کی شکلیں پانیوں پر ابھرتی ڈوبتی دیکھتے تھے..

مُوئے حسین اُن کے برابر میں بیٹھا اُن شفاف شیشہ پانیوں کو تکتا جاتا تھا.. اُن پر آنکھیں رکھے یہ توقع کرتا تھا کہ اُس کی شکل بھی اُن پر ظاہر ہوگی.. پر وہاں اُن پانیوں کی شیشہ گری میں اُس کا چہرہ منعکس نہ ہوتا تھا.. وہاں اُن آٹھوں پرندوں اور اُن سے الگ بیٹھے تین پرندوں کے چہرے تو تھے مُوئے حسین کا چہرہ نہ تھا، ایک اور پرندہ تھا...

وہ نہ تھا، پانیوں پر جھکا وہ تھا پر وہاں اُس کی شکل نہ تھی، ایک پرندہ تھا..

اُس نے محسوس تو کیا تھا کہ وہ، وہ نہ رہا تھا، جو کہ وہ تھا، اُس کے تن بدن میں ایک تغیر رونما ہو رہا تھا.. اُس کی انسانی ہیئت میں ایک تبدیلی نمودار ہو رہی تھی، جس پر اُس کا کچھ اختیار نہ تھا.. اُس کے بازوؤں میں سے گویا پروں کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، پاؤں، پنجوں کی مانند پھیل رہے تھے.. اُس کے پورے بدن میں سے جیسے بھری برساتوں کے بعد چٹانوں کی دراڑوں میں سے بُوٹے پھوٹتے ہیں ایسے بال و پر پھوٹ رہے تھے، روئیں روئیں میں نازک کلیاں کھلتی جاتی تھیں، اُس کی

ناک جو بہت تیکھی تھی مزید تیکھی اور نوکیلی ہوگئی اور زبان سکڑتی گئی.. اُس کی وہ آنکھیں جو کبھی مدھ بھرے پیالوں ایسی سرخی مائل خمار آور ہوا کرتی تھیں، وہ بھی مختصر ہوتی سمٹتی گئیں، مہین اور نہایت رنگین ادا ہوگئیں، اُس کے ایک مصور دوست کا کہنا تھا کہ اگر غیب پر مکمل ایمان لانا چاہو تو کبھی غور سے کسی مویشی یا پرندے کی آنکھیں دیکھو، اُن میں رنگوں کے سحر کے ایسے پرکشش خزینے ہوتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاوے اور مبہوت ہو جاوے.. اُس کی نئی پرندہ آنکھیں بھی ایسی ہی کشش والیاں رنگوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اگر وہ خود کو دیکھ سکتا تو.. اپنی ہی آنکھوں کو بھلا کیسے قریب آ کر غور سے دیکھا جاوے ہے..

وہ اپنی بدنی ہیئت کی لحہ بہ لحہ تبدیلی کو محسوس تو کر رہا تھا، اپنے آپ کو مختصر مختصر مٹھی بھر ہوتے محسوس تو کر رہا تھا پر یہ نہیں جانتا تھا کہ بالآخر وہ کونسی شکل اختیار کرے گا یا شاید مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہو جائے لیکن اُس پر جو گزرتی جاتی تھی، کونپلیں، بال و پر، اُن بال و پر میں رگوں کا پھیلتا جال وہ اس تبدیلی سے ہراساں نہ ہوا تھا، اُس نے اپنے آپ کو اس ناگہانی تبدیلی کے سپرد کر دیا تھا..

خون کی گردش بھی مختصر مختصر مدھم مدھم ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ اُس کا دل بھی اگرچہ مختصر ہوا لیکن اُس کی دھک دھک یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کسی چڑیا کے بچے کو مُٹھی میں لینے سے اُس کے ملوک مُٹھی بھر بدن میں سے پھوٹتی مدھم گرمائش مٹھی میں محسوس ہوتی ہے.. انگلیوں کی درزوں میں سے باہر آتی پھڑ پھڑاتی ہے.. سمٹتا سکڑتا اُس کا جو دل تھا چڑیا کا بچہ ہوگیا، ہولے ہولے دھڑکنے لگا..

اُس کی پرندہ آنکھیں جو کچھ دیکھتی تھیں، وہ ایک نیلے پردے کے پار ہر شے کو نیلاہٹ میں ڈوبی ہوئی دیکھتی تھیں، انسانی آنکھ کے سب رنگین تماشے یک رنگ ہو گئے تھے اور جتنی اشیاء نظر آتی تھیں آؤٹ آف فوکس اور لرزتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں.. تبدیلی ہیئت کے کرشمے عجب تھے.. کایا پلٹ کے اس غیر اختیاری عمل سے وہ ہراساں تو نہ ہوا بلکہ وہ اس تبدیلی کی کیفیت کے سحر میں گرفتار

ہو گیا، اپنے آپ کو سپرد کر دیا.. کہ وہ کب کا منطق اور حقیقت سے ماورا ہو کر ایسے جہانوں کا مسافر ہو چکا تھا جہاں وہی تھا جس کا اعتبار کیا..

"مُوئے، رات کے اس پہر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے پہلو میں تم نہیں، کوئی پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہے.. میں جانتی ہوں کہ یہ تم ہو کہ پرندے خراٹے نہیں لیتے.. مجھ سے جڑ کر مت سوؤ.. یہ ڈبل بیڈ نئی تہذیب کی سب سے بڑی لعنت ہے.. ابتداء میں یہ ایک جنس بھری آسودگی کی آسائش ہے، ریسلنگ کا ایک مَیٹ ہے جس پر آپ اپنے اپنے داؤ لگاتے لوٹتے رہتے ہیں، ہر عمر کی اس انتہا میں یہ تمہاری پشت میں ایک درد ایک اذیت ہے.. کاش کہ ہمارے بستر الگ الگ ہوتے تا کہ نہ تمہیں اپنی نامردگی کی شروعات کا قلق ہوتا اور نہ ہی مجھے اپنے افزائش نسل کے پانیوں کے بہاؤ کے تھم جانے پر بنجر پن کا کوئی احساس میری زندگی کو اجیرن کرتا..

کیا تم گہری نیند میں ہو یا سونے کا بہانہ کر رہے ہو؟ اور پلیز یوں پھڑ پھڑاؤ مت.. کیا تم سُن رہے ہو؟.. میں تمہیں ایک انہونی کے ہونے کی خبر کرنا چاہتی ہوں.. تمہارے اُس پُورن بھگت نے کام دکھا دیا ہے، تم نے نہیں اُس باسٹرڈ نے مجھے پریگنٹ کر دیا ہے... کہ ایک مدت سے مجھے سینٹری ٹاولز کو ایک جاپان سومو پہلوان کی مانند اپنے چُوتروں پر باندھنے کی حاجت نہیں ہوئی تھی اور اس کے باوجود میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں.. حاملہ ہو چکی ہوں.. تمہاری نامردی اور میرے بنجر پن میں سے ایک کونپل پُھوٹ نکلی ہے..

مُوئے.. مجھے خدشہ ہو رہا ہے کہ تم نہیں، کوئی پرندہ میرے بستر میں اپنے پروں سے کروٹ بدلتا.. مجھے بے آرام کرتا ہے، میرے پُھولتے ہوئے پیٹ پر ایک گھونسلا بنانے کی کوشش کر رہا ہے..

مُوئے تمہارے پُورن بھگت نے اپنا کام دکھا دیا ہے..

آئی لو پُورن!

تبدیلی ہیئت کے یہ کرشمے ازل سے کائناتوں کے ظہور کے پہلے کُن فیکون سے ایسے انسانوں کو ودیعت کر دیئے جاتے ہیں جن میں معمول سے روگردانی کرنے کی سکت ہوتی ہے.. سلگتی جھاڑی میں سے کلام کرنے والے کی آواز سن کر بھی ہوش میں رہنے کی.. میخوں سے ٹھونکے جانے کے باوجود برداشت اور صبر کی.. طائف کے باغ عداس میں انگور کی ایک بیل کے سائے میں پناہ لیتے خون آلود پاؤں والے کی بددعا نہ دینے کی سکت.. یہ وصف روزِ ازل سے بقیہ خدائی سے الگ تخلیق کیے جانے والے انسانوں میں بھرا ہوتا ہے.. اور اُن لمحوں میں جب وہ جبل طور پر قدم رکھتے ہیں، یروشلم کی گلیوں کے پتھروں پر اپنی صلیب گھسیٹتے ہیں، جبل نور پر چڑھتے ہیں تو اُن کے اندر بھی ایک تبدیلی ہیئت جنم لیتی ہے، وہ، وہ نہیں رہتے جو کہ وہ تھے.. طاہرہ کو جب ایک اندھے کنویں میں گلا گھونٹ کر گرایا جاتا ہے، حلّاج کی لاش کو جلا کر اُس کی راکھ فرات میں بہا دی جاتی ہے، بایزید بسطامی جب حج کو ترک کر کے ایک خارش زدہ کُتّے کے بدن پر مرہم رکھتا ہے، مولانا رُوم کے علم و دانش کو شمس تبریز کی ایک نظر آگ لگا دیتی ہے، ہمیشہ سچ کہنے والا اچپل سرمست ہو جاتا ہے، بلھے شاہ مُرشد کو منانے کے لیے پاؤں میں گھنگھرو باندھ لیتا ہے.. تو ان سب میں تبدیلی ہیئت جنم لیتی ہے، وہ، وہ نہیں رہتے جو کہ وہ تھے.. یہ سب نوازے گئے لوگ ہوتے ہیں، مُوئے حسین آگاہ ہو چکا تھا کہ وہ بھی نوازا جا رہا ہے.. سمٹتا ہوا، مختصر ہوتا ایک پرندہ ہو رہا ہے..

تبدیلی ہیئت کا ایک اور کرشمہ ایک عطر فروش، متمول اور متکبر فریدالدین نام کا شخص تھا جو عطار کہلاتا تھا.. نیشاپور میں کاروبار کرتا تھا.. آج کے زمانوں کا ایک فیشن ہاؤس، ایک پرفیومری چلاتا تھا، ایک فقیر جو دستِ سوال دراز کرتا ہے اُسے بار بار دھتکارتا ہے تو وہ فقیر کہتا ہے کہ اے عطار اتنا تکبّر.. تو مرے گا کیسے.. فریدالدین اُس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہتا ہے، جیسے تُو مرے گا.. فقیر کہتا ہے، ایسے.. وہ زمین پر لیٹ کر اپنا خرقہ اوڑھتا ہے اور مر جاتا ہے.. اُس لمحے فریدالدین کے بدن میں

سے اُن پرندوں نے جنم لیا جو سچ کی تلاش میں سرگرداں قاف کے پہاڑ تک سفر کرتے ہیں، فرید الدین عطار کی ہیئت بھی سراسر بدل گئی، اُس نے کاروبار تمام کیا اور قدم قدم پہ جنوں اختیار کیا..

"اے دِلا گر درد جوئی سوی نیشاپور برو
مرد صاحبِ درد یارم شاہ عطار مست درو
ای صبا گر بگذری از کوئے آں جانانِ من
حال احوالِ حقیقت در حضورش باز گر
کز کلامش مست باشم از جہان بگذشتہ ام
گر تو ہم عاشق شوی پس وصلت و منطق شنو

اے دل تو درد کا طلب گار ہے تو نیشاپور جا
کیونکہ وہ مردِ خدا جو صاحبِ درد ہے اور میرا یار..
یعنی خواجہ عطار وہیں رہتا ہے..
اے صبا، اگر تو میرے محبوب کی گلی سے گزرے
تو ساری حقیقت حال اُس کے حضور بیان کرنا..
میں اُس کے کلام سے مست ہو کر دنیا سے دستبردار ہو گیا ہوں..
تو بھی اگر عشق کرنا چاہے تو 'وصلت نامہ'
"منطق الطیر" سُن لے..

عطار کے وہی پرندے ٹلہ جوگیاں کے کائی زدہ قدیم تالاب کی آخری سیڑھی پر براجمان اُن پانیوں میں اپنے عکس تلاش کرتے تھے جو ابھی تو گدلے اور اندھے تھے اور ابھی شفاف اور شیشہ آئینہ ہو گئے تھے..وہ اُن پانیوں پر جھکے اپنی اپنی شکلیں دیکھتے تھے جب انہیں اُن میں ایک اور اجنبی پرندہ عکس ہوتا نظر آنے لگا...وہ اُس سے واقف نہ تھے..سچ کی تلاش کی اڑانوں اور موت کی وادیوں پر سے گزرتے ہوئے وہ تو اُن کے برابر میں پرواز نہ کرتا تھا..اُس نے نیشاپور میں نہیں یہیں کہیں ٹلہ جوگیاں میں جنم لیا تھا، اُن کی شکل کا نہ تھا، عقیدے اور عشق کے وصال سے نمودار ہونے والا ایک غیر، اجنبی اجنبی پرندہ تھا..اُن میں سے تو نہ تھا..اور اُس کے باوجود وہ اُس کے وجود سے کیسے انکاری ہو سکتے تھے کہ اس نووارد میں اُنہیں اپنی اپنی شباہت کے شائبے ہوتے تھے..

''یہ کون ہے؟''

''تم کون ہو؟'' سب پرندے اپنے استغراق میں سے باہر آ کر گُو کنے لگے..

''ہم میں سے نہیں ہو..''

''میں کیا جانوں کہ میں کون ہوں...نہ میں آدم حوا جایا، نہ میں نے بھید مذہب کا پایا..کیا جانوں، لیکن یہ جانوں کہ میں موسےٰ ہوں، فرعون نہیں..''

''شُو شُو..اڑ جاؤ..تم ہم میں شامل نہیں ہو سکتے..ہم نے تو سچ کی تلاش میں بہت صعوبتیں سہی ہیں اور تم بہت نومولود اور دُکھ سے ناآشنا لگتے ہو..تم ہم میں سے نہیں ہو..شُو شُو..''

''اگر میں تم میں سے نہیں تو یہ کیا ہے کہ تم سب اپنی اپنی شباہتیں مجھ میں دیکھتے ہو..شفاف پانیوں پر جھکتے ہو تو میری شکل بھی تو عکس ہوتی ہے، میں اجنبی نہیں، سچ کی تلاش میں، میں بھی بہت بھٹکا، میں تمہارا ہی ہم سفر رہا پر تم نے کبھی میری موجودگی پر دھیان نہ دیا..میں ایک ایسا پرتو ہوں جو ہمیشہ سے تمہارے ہمراہ مائل پرواز رہا پر میں اوجھل رہا، اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا، اب جا کر ظاہر ہوا ہوں

تو تم بے یقین ہوتے ہو۔"

وہ سب بے یقینی کی اُلجھن میں اُلجھ گئے، اس اجنبی کو قبول کریں یا نہ کریں..

اور وہ شیشہ ہو چکے پانیوں پر جھکے ہوئے اپنی شکلیں عکس ہوتے دیکھتے تھے..جو سچ کی آخری شباہتیں تھیں اور اُن کے پہلو میں اُنہی کا ایک ہم شکل پرندہ بیٹھا ہوا تھا..جس کے وجود سے نہ وہ انکاری ہو سکتے تھے اور نہ اقرار کر سکتے تھے، اُسے قبول کرنے میں تامل کرتے تھے..

"بے سود، بے سُود.." جھلسا ہوا پرندہ گویا ہوا "ہمارا سفر رائیگاں گیا..ٹلہ جوگیاں کے اس تالاب کے اب آئینے ہو چکے پانیوں میں بھی ہم نے اپنے آپ کو ہی روبہ رو، چہرہ بہ چہرہ پایا، جیسا کہ قاف کے پہاڑ کے پردوں کی روپوشی میں پایا، سچ تبدیل نہیں ہوا۔"

"نہیں ہوا.." ابن مریم کی صلیب پر قیام کرنے والے پرندے نے کہا "یہ وہی سچ نہیں جس پر ہم سب صدیوں سے اندھا یقین کرتے آئے ہیں..ذرا دیکھو تو سہی اس سچ میں ہیر، سوہنی اور صاحباں کے جنوں خیز عشق کی آمیزش ہے، ہم اب تک روکھے پھیکے تھے، ان تینوں نے ہمیں عشق آتش سے آشنا کر کے مکمل کر دیا۔تم بھی تو کچھ بولو.." وہ اُن سے مخاطب ہوا..

صاحباں نمائندہ ہو گئی "مرزے کے سینے میں میرے بھائیوں کے چلائے ہوئے تیر ابھی تک پیوست ہیں..ہم تینوں بول نہیں سکتے، صرف سہہ سکتے ہیں.."

"میں تو کب کی ڈوب چکی.." سوہنی پرندے نے اپنے آپ میں ڈوب کر کہا..

"میں جاناں جوگی دے نال.." ہیر شرمائی اور لجائی..

"آؤ.." جھلسے ہوئے پرندے نے اپنے ساتھیوں سے کہا "عشق کے یہ پرندے کُوچ کرنے والے نہیں اسی سرزمین میں سے پُھوٹنے والے گُل و بُلبل ہیں..ہم اپنے نیشاپور کو لوٹ چلیں..میں اپنی جلتی ہوئی جھاڑی کے لیے اداس ہو چکا ہوں.."

"ابن مریم ابھی تک صلیب پر آویزاں ہے، مجھے اُس کے پیاسے حلق میں ایک بُوند پانی کی ٹپکانا ہے.."

"بندرابن مجھ سے اداس ہے.."

"مجھے بُدھ کی راکھ کو اپنی چونچ میں بھر کر ہندوستان میں بکھیرنا ہے.."

"غارِ حرا کے شگاف میں میرا گھونسلا کب سے ویران پڑا ہے.."

"بلخ کے کھنڈروں میں مجھے پھر سے آہورا مزدا کی شان میں بجھ چکی آگ کو پھونکیں مار مار کر پھر سے بھڑکانا ہے.."

"مجھے پھر سے روبہ رو بہ چہرہ بہ چہرہ ہونا ہے.."

"اپنے ہی لہو سے پھر وضو کرنا ہے.."

"آؤ..لوٹ چلیں.."

مُوئے چپ نہ رہ سکا، بمشکل اپنی چونچ کھولی کہ اُسے اب تک مُنہ کھولنے کی عادت تھی، چونچ کھولنے کی نہیں.. "تم سب واپس چلے جاؤ گے؟"

"ہاں.." سب بہ یک آواز گُوکے.. "ہم یہاں سے نیشاپور کے مسافر ہوں گے..عطار کو اطلاع کریں گے، وہ منتظر ہو گا، ہم اتنے خودمختار تو نہ تھے کہ اپنے من کی موج میں آ کر خود ہی اُڑانوں میں آ گئے..مختار تو عطار تھا..ہم اُسی کے چرخے پر کاتے گئے سُوت کے دھاگوں سے اُس کے ساتھ بندھے تھے اور ہم نے اس سُوت کے ہر ذرّے میں اپنا دل باندھا اور یہ وہ تھا جس نے روئی دھنکنے والے ایک دُھنیے کی مانند اُس دھاگے کے اِکتارے کا تار چھیڑا، یوُں ہم سب کے بندھے ہوئے دل دُھنکے گئے، ہمیں خبر ہو گئی کہ یہ اُس کا اذن ہے، اُسکے جذب کی دھنکی ہوئی اکتارے کے ایک تار میں سے اُس کی خواہش کا تونا بجتا ہے کہ چلو اپنے کب کے سمیٹے ہوئے پَر کھولو..

نو سو برس ہونے کو ہیں جب اُس فقیر نے زمین پر لیٹ کر اپنا خرقہ اوڑھ کر کہا تھا کہ..

ایسے.. میں ایسے مروں گا اور وہ مر گیا تھا اور تب میں نے دنیا تیاگ کر اس دنیا کے سب عطروں، مہکوں اور خوشبوؤں سے کنارا کر کے، صرف ایک ایسے عطر کو کشید کرنے کی خاطر جو مجھے بھی سچ کی ماہیت سے آگاہ کر دے، میں نے تمہیں اپنے تخیل سے تخلیق کیا تھا.. اور میں اگرچہ حق تھا پر رب تو نہیں تھا کہ میرے صرف یہ کہنے سے کہ "ہو جاؤ" تم ہو جاتے.. میں تو خاکی تھا تمہیں اپنی خاک سے تخلیق کیا.. ریاضتوں، عبادتوں، رت جگوں اور منت سماجتوں کی مٹی سے تمہیں کُوٹ کُوٹ کر گوندھا، اُس مٹی میں ندامت، اطاعت اور شکر گزاری کے آنسوؤں کے پانی آمیزش کیے.. پھر اُس مٹی کو چاک پر چڑھایا، گھمایا، اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اُس گھومتی مٹی پر جمایا.. سانس روکے رکھا اور اس کے باوجود تم وجود میں نہ آتے تھے، وجود میں آنے لگتے تو ڈھے جاتے اور میں پھر تمہیں چاک پر چڑھاتا صدیوں گھماتا رہا اور تب میں نے ابن مریم سے فریاد کی اور اُس نے اپنی پھونک سے تم سب کو زندہ کر دیا اور تمہاری مٹی میں سے چہکنے، پکارنے اور گیت گانے کی آوازیں آنے لگیں، پوری کائنات تمہاری چہکار سے پُر شور اور نغمہ گر ہو گئی.. سچ ایک ہی مقام پر توازن میں نہیں رہتا، جامد نہیں ہوتا.. اُس کا کوئی ایک مستقل پڑاؤ نہیں ہوتا.. اُس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنی برداشت کے مطابق اس کے راستے پر گامزن رہتا ہے، سچ کی تہیں کُھلتی جاتی ہیں، یہ سلجھتا جاتا ہے جیسے ہم کُھلتے اور سلجھتے جاتے ہیں.. وہ جو اپنے عقیدے پر تکبّر سے جمے رہتے ہیں، اپنے پتھر ہو چکے ایمان سے چمٹے رہتے ہیں، وہ اُس راستے سے محروم رہ جاتے ہیں جو ربّانی گہرائیوں میں اترتا ہے، جہاں ایک عظیم سمندر اُن کا منتظر ہے.."

تو یہ عطار تھا جس نے ہمیں تخلیق کر کے سات وادیوں کے پار قاف کے پہاڑ تک اُڑانیں کرنے کا حکم دیا تا کہ ہم صرف اپنے لیے ہی نہیں بلکہ اُس کے لیے بھی سچ کی اصل شکل دیکھ آئیں

اور یہ وہی عطر فروش تھا جس نے ہمیں ٹلہ جوگیاں کی جانب کُوچ کرنے کے لیے کہا کہ اُس نے خود ہی تو کہا تھا کہ سچ کا کوئی مُستقل پڑاؤ نہیں ہوتا، اُس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں.. ٹلہ جوگیاں بھی ایک اور ٹھکانا تھا.. ہم واپس جائیں گے اور اُسے خبر کر دیں گے کہ ہمارا سفر رائیگاں گیا.. لاحاصلی ہمارا مقدر ٹھہری.. ہم طلب گار گئے تھے، ہماری جھولی خالی ہی رہی کہ سچ ابھی تک وہیں جامد ہے.. قاف کے پہاڑ پر جب ہم سب اپنی شکل کے روبرو تھے تو یہاں بھی وہی معاملہ ہے، کچھ بھی نہیں بدلا.. اُسے خبر کریں گے..''

''اگر تم غور کرو تو..''

اُن سب نے آخری بار پانیوں کے شیشے میں اپنا دیدار کیا، پَر پھڑ پھڑائے کُوچ کرنے کو تھے جب مُوسے نے کہا.. اگر تم غور کرو تو..

وہ ٹھہر گئے..

''کاہے پر غور کریں اے نومولود پرندے؟'' انہوں نے بیزاری سے پوچھا..

''تم اگر پانیوں پر نقش اپنی شکلوں پر غور کرو تو اُن کی شباہتوں میں فرق آچکا ہے.. قاف کے پہاڑ پر تمہارے سامنے جو تمہاری ہم شکلی ظاہر ہوئی تھی، ٹلہ جوگیاں کے اس تالاب کے پانیوں پر تمہاری وہ شکلیں نہیں ہیں، ان میں فرق آچکا ہے..''

تب انہوں نے غور کیا..

اُن کے چہرے واقعی وہ نہ رہے تھے جو کہ تھے..

اُن کی کرختگی اور عقیدے کی پتھر دلی پر.. جیسے کسی مزار پر چادریں بچھی ہوتی ہیں، ایسی ملاحت، محبت، نرم خُوئی اور عشق کی شفق میں رنگی چادریں بچھی ہوئی تھیں.. پانیوں پر اُن کے نئے چہروں کے چراغ جلتے تھے.. وہ حیرت کی وادیوں میں گم ہو گئے کہ پل بھر میں یہ کیا ماجرا ہو گیا..

اُنہوں نے اُس تحیّر کے عالم میں مُوتے سے رجوع کیا ''یہ کون ہیں جو پانیوں پر عکس ہوتے ہیں، ہم تو نہیں ہیں..''

''یہ تم ہی ہو.. غور کرو کہ جب تم اس تالاب کے کناروں پر سچ کی تلاش میں آن اترے تھے تو تم گیارہ تھے، اب غور کرو کہ صرف آٹھ رہ گئے ہو. تمہارے برابر میں براجمان زمینی عشق کے تینوں پرندے موجود نہیں..''

انہوں نے دائیں بائیں نگاہ کی، وہ موجود نہ تھے..

''وہ تینوں تم میں مدغم ہو چکے ہیں، تمہاری ذات میں تحلیل ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو فنا کر لیا البتہ تمہیں مکمل کر دیا. تمہارا قاف کا سچ متروک ہوا، عشق کی آمیزش سے ایک نئے سچ نے جنم لیا..''

اُنہوں نے مزید جھک کر پانیوں کو دیکھا اور اُن.. پانیوں پر عشق کی گھلاوٹ سے، ملاحت اور بے پروائی سے پھوٹنے والے ایک آج کے سچ کے شاہے آئینہ ہوتے جاتے تھے..

''ذرا غور تو کرو، ذرا اور جُھک کر پانیوں کے مزید قریب ہو جاؤ اور دیکھو تو سہی اپنی سوہنی ہو چکی شکلیں جن میں سوہنی کے سوہن پن کی گھلاوٹ گُھل گئی ہے.. اپنی اُن کرخت آنکھوں پر غور کرو جن میں صاحباں کے سیندورے نینوں کے سیندھور اب تمہارے نین نشیلے کرتے ہیں، وہ جو ہیر تصویر کشمیر جٹی جس کے نقش روم والے تھے اور جس کے روئیں روئیں میں سے عشق بولتا تھا، ذرا غور تو کرو کہ تمہاری شباہتوں میں اُس کے نقش منتقل ہو گئے ہیں، تمہارے وہ روئیں جو ایک مدت سے اپنے اپنے عقیدے کی مَیل سے بند ہو چکے تھے، وہ سب کُھل گئے ہیں اور ہر روئیں میں سے عشق کلام کرتا ہے.. ذرا دیکھو تو سہی، غور تو کرو..''

''ہاں ہم نے غور کیا..'' اپنی نئی شکلیں دیکھ کر وہ بے خود ہوئے اور چہکنے لگے.. اُن سب نے

اقرار کیا ”ٹلہ جوگیاں کا سفر رائیگاں نہ گیا ہم پہلے سے کہیں بڑھ کر دل کش اور رنگین ہو گئے ہیں، ہم عطار کو خبر کر دیں گے کہ تمہارے قول کی سچائی میں کچھ شک نہیں کہ سچ ایک ہی مقام پر توازن میں نہیں رہتا، اس کی ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں. سفر رائیگاں نہیں گیا.. ہم اُس کو خبر کرتے ہیں..“

انہوں نے ایک مرتبہ پھر پانیوں پر تصویر ہوتی اپنی عشق کے چراغوں سے روشن ہوتی شکلیں دیکھیں، سمٹے ہوئے پروں پر سے سفر کی دھول پھڑ پھڑا کر جھاڑی اور خبر کرنے کے لیے اُڑ جانے کو تھے جب اُنہیں اس نومولود پرندے کا خیال آ گیا جس نے اُنہیں غور کرنے کی نصیحت کی تھی، قرآن کے احکام کے مطابق غور کرنے کا مشورہ دیا تھا..

”تم نہیں چلو گے؟“

”ابھی تو تم مجھے حقارت سے شُوشُو کرتے اڑ جانے کے لیے کہتے تھے اور اب مجھے اپنا شریک کرنے کے لیے درخواستیں کرتے ہو.. نہیں، میں نے کہیں نہیں جانا.. میرا تو ابھی ابھی جنم ہوا ہے.. ابھی تک میرا بدن پیدائش کی گیلاہٹ میں لتھڑا ہوا ہے اور میں اپنی تخلیق کے لیے کسی عطار کے چاک کا محتاج نہیں.. مجھے میری اپنی مٹی نے جنا ہے اُسی نے اُس چاک پر چڑھایا ہے جس پر سوہنی کا کچا گھڑا، گھوم چرخ گھوم، گھومتا تھا.. اور جب ہیر نے کہا کہ میں جاناں جوگی دے نال، کنیں مندراں پا کے، متھے تلک لگا کے تو میں نے اپنے کان پھڑوائے اور اُن میں بالیاں پہن کر اُس کی چوکھٹ پر جا صدا دی.. اور سدا سلامت رہے جنڈ کا وہ شجر جس کے تلے مرزا، صاحباں کے بھائیوں کے تیروں سے چھلنی پڑا تھا... مجھ میں چناب کے پانیوں نے اپنی روح پھونکی تو مجھ میں جان پڑ گئی.. میں منت کش ابن مریم نہ ہوا. تم پردیسی ہو.. میں اپنے دیس میں ہوں.. میں نے کہاں جانا ہے.. مجھے نیشاپور سے کیا غرض، جھنگ، گجرات اور داتا باد میرے نیشاپور ہیں، مجھے قاف پہاڑ سے کیا لینا دینا کہ میرا ٹلہ جوگیاں ہی مجھے انا الحق کے راستے دکھا سکتا ہے.. تمہاری جاہ اور سکندری تمہیں مبارک ہو اور مجھے

میری فقیری، اچھی ہو یا بری مبارک ہو. تم اڑان بھرو، اپنا سفر کھوٹا نہ کرو.. میں نے کہاں جانا ہے.."

وہ پانچوں رنجیدہ بہت ہوئے، ملال ایک آسیب کی مانند اُن کے بال و پر میں رچ گیا.. انہوں نے آخری بار پانیوں کے شیشے میں اپنی بدل چکی شباہتوں کا دیدار کیا، پھر ہر پرندے نے پانیوں میں اپنی چونچیں ڈبو کر سچ کی شراب کا ایک ایک گھونٹ اپنے حلق میں اتارا، اُن کی سیندوری ہو چکی آنکھوں میں اشکِ بلبل جتنے آنسو بھر آئے اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر مُوسٰے سے کہا۔"تم ہمارے ساتھ چلو.. جب تک آپ کو اپنے نامکمل ہونے کا احساس نہیں ہوتا آپ تب تک مکمل نہیں ہو سکتے تو ہم آج مکمل ہوئے، ہمارے ساتھ چلو.."

مُوسٰے نے اُن سب کے آنسو پونچھے اور کہا.. یہ ہماری آخری ملاقات تو نہیں ہے، یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں کہ بقول عطار سچ ایک ہی مقام پر توازن نہیں ہوتا، اُس کے پڑاؤ بدلتے رہتے ہیں تو آج کا سچ بھی کبھی نہ کبھی اپنی ہیئت بدلے گا اور جیسے آٹھ نو سو برس کے بعد تم سب سچ کے ایک اور عکس کو متشکل دیکھنے کی جستجو میں مائل پرواز ہوئے تو آج سے کون جانے کتنے ان گنت برسوں کے بعد تم پھر اپنے اپنے آشیانوں سے نکلو گے تب ہم ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے ہوں گے، اُن زمانوں کے کسی جبل طور پر، جبل نور پر، ٹلہ جوگیاں پر، تو تب ملاقات ہوگی.. یہ عارضی جدائی ہو سکتا ہے ہزاروں برسوں پر محیط ہو، ہو سکتا ہے ایک دن کی ہو.. پر ہم دوبارہ ملیں گے..

اُن کے سیندوری نین آنسوؤں سے لبریز، بہ چشم نم وہ مُوسٰے کے پرندہ گلے لگ کر تادیر سوگواری میں پھڑ پھڑائے اور پھر انہیں اپنے پروں سے پونچھتے جُدا ہوئے اور اڑان کر گئے..

اُن کی رخصتی سے ٹلہ جوگیاں کی خاموشیوں میں اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے جو عارضی ارتعاش پیدا ہوا تھا، وہ پھر سے ایک گہرے چُپ سکوت میں چلا گیا.. پانیوں کے آئینوں میں ایک تنہا عکس باقی رہ گیا..

مُوسلے نے ان پانیوں میں تصویر ہوتی شکل میں اپنی چونچ ڈبوئی تو وہ دائروں میں منتشر لمحہ بھر کے لیے ہوئے اور پھر سمٹ کر سکوت میں چلے گئے... تالاب کے گرد بوسیدگی کی کھنڈر دیواروں میں ابھی تک جتنے طاقچے موجود تھے، نانک کی چلّہ گاہ کی آخری موجود دیوار میں وہ جو پانچ محرابیں کب کے بجھ چکے دیوں کے دھوئیں سے کالک زدہ تھیں، اُن سب میں صدیوں سے بجھ چکے چراغ بھڑک کر جل اٹھے اور ہر سُو روشنی ہوگئی..

ابتداء آفرینش میں ہر سُو تاریکی تھی اور پانیوں پر ایک دُھند تیرتی تھی اور پھر اذن ہوا کہ روشنی ہو جا.. اور روشنی ہوگئی..

صرف تالاب کے گرد کھنڈر دیواروں کے طاقچوں میں نانک کی چلّہ گاہ کی بوسیدہ محرابوں میں ہی نہیں، تالاب کے پانیوں میں بھی اور ہری بھرتری کی کھنڈر ہو چکی سمادھی پر بھی چراغ جل اٹھے..

اور ہر سُو روشنی ہوگئی.....

لاہور ۲۱ رستمبر ۲۰۱۷ء

●○●○●○

مستنصر حسین تارڑ

مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: نکلے تری تلاش میں،
مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: بہاؤ، راکھ، قربت مرگ
مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: پیار کا پہلا شہر، جپسی، دیس
''حراموش ناقابل فراموش'' (سفرنامہ)
۱۵ کہانیاں
آسٹریلیا آوارگی
امریکہ کے سو رنگ
سفر سندھ کے'' اور سندھ بہتا رہا''
پیار کا پہلا پنجاب
خس و خاشاک زمانے (ناول)
''ہیلو ہالینڈ'' (سفرنامہ)
''الاسکا ہائی وے'' ...
خطوط: شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر
اے غزال شب... (ناول)
منہ ول کعبے شریف (سفرنامہ حج)
غار حرا میں ایک رات
سنہری اُلو کا شہر
نیو یارک کے سو رنگ
ماسکو کی سفید راتیں (سفرنامہ)
تارڑ نامہ
تارڑ نامہ ۲
تارڑ نامہ ۳
تارڑ نامہ ۴
تارڑ نامہ ۵
تارڑ نامہ ۶
لاہور سے یارقند
فاختہ (ناولٹ)
راکاپوشی نگر
لاہور آوارگی
یاک سرائے
کے ٹو کہانی
اُندلس میں اجنبی
ہنزہ داستان
سفر شمال کے
نانگا پربت: بلتستان داستان
خانہ بدوش
نکلے تیری تلاش میں
چترال داستان: ...
پتلی پیکنگ کی
بہاؤ
راکھ
پیار کا پہلا شہر
پیار کا پہلا شہر
جپسی
دیس ہوئے پردیس
ہزاروں ہیں شکوے
ہزاروں راستے
گزارا نہیں ہوتا
چک چک
پرندے'' پکھیرو'' اور'' فاختہ'' (دو ناولٹ)
پکھیرو
سنولیک: بیافو، ہیسپر۔ دنیا کے طویل ترین برفانی راستے
قلعہ جنگی (ناول)
سیاہ آنکھ میں تصویر
کارواں سرائے
اُلو ہمارے بھائی ہیں
مورت
پرواز
نیپال نگری
شمشال بے مثال
شتر مرغ ریاست
گدھے ہمارے بھائی ہیں
قربت مرگ میں محبت
بے عزتی خراب
دیوسائی: دنیا کے بلند ترین میدان دیوسائی کے پار
شہپر (نیلی کہانی)
سورج کے ساتھ ساتھ
ڈاکیا اور جولاہا (ناول)
برفیلی بلندیاں ...
کالاش: وادی کافرستان کا ڈرامائی سفرنامہ
رتی گلی (وادی کاغان اور آزاد کشمیر)

Rs. 700.00

www.sangemeel.com